قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا بہتّرواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

مئی 2015ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب!
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب!
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی!
ندرتِ فکر و عمل سے سنگ خارہ لعل ناب!

علامہ اقبالؒ (بالِ جبریل ''مسولینی'' سے انتخاب)

جلد 68 شمارہ نمبر 05 مئی 2015ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: دیت قرآن کی روشنی میں	ادارہ	4
پرویز صاحب کا نظریۂ اجتہاد (فقہ)	ملک منظور حسین لیل	10
قرآن اور انسانی عقل	ڈاکٹر اعجاز رسول	20
روح انسانی کا عقیدہ قرآن کے خلاف ہے	خواجہ ازہر عباس	26
متحرک نفسیات (آخری قسط)	راجہ عبدالعزیز	37

ENGLISH SECTION

Surah *Al-Naziat* (النّٰزِعٰت) – Durus-al-Qur'an By G.A.Parwez

Parah 30: Chapter 5 Translated by: Dr. Mansoor Alam 51

ناشر و چیئرمین

محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق ۔ ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی

محمد سلیم اختر

قانونی مشیر

ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

زرِتعاون 40 روپے فی پرچہ

پاکستان -/450 روپے سالانہ

بیرون ملک 2500 روپے سالانہ

بینک اکاؤنٹ نمبر

3082-7 نیشنل بینک آف پاکستان، مین مارکیٹ گلبرگ

برانچ کوڈ (0465) ۔ لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ نمبر 2، لاہور ۔ 54660، (پاکستان)

فون: 042-35714546

E-mail: idarati@gmail.com

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

ابھی تک آدمی صید زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خرد مندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
خروش آموزِ بلبل ہو، گرہ غنچے کی وا کردے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے
پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولاں گہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے
بیا پیدا خریدارست جانِ ناتوانے را
''پس از مدت گذار افتاد بر ما کاروانے را''

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

لمعات

دیت قرآن کی روشنی میں

18 اپریل 2015ء کے روزنامہ پاکستان میں ''دیت، شرعی پہلو سے تشریح کی ضرورت'' کے عنوان سے ایک اداریہ شائع ہُوا ہے جس میں دیت اور قصاص کے موضوع پر ابہام کے باعث پاکستانی شہریوں کے اذہان وقلوب میں اضطراب کا ذکر کیا گیا ہے۔ نیز ''علماء کرام'' سے رہنمائی کی اپیل بھی کی گئی ہے۔ روزنامہ پاکستان کے اداریہ کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

''لاہور میں فائرنگ کی ایک واردات میں ایک رئیس زادے کی مبینہ فائرنگ سے ایک یتیم نوجوان جاں بحق ہوگیا، بیوہ والدہ کا اکیلا بیٹا رخصت ہوکر ماں اور بہنوں کو مستقل روگ دے گیا ہے، پولیس نے مقدمہ درج کرکے سابق وزیر مملکت برائے امور خارجہ صدیق کانجو کے اس صاحبزادے کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کرکے اُسے گرفتار کرلیا ہوا ہے اور مختلف پہلوؤں سے تفتیش کی جارہی ہے، وزیراعلیٰ نے خود نوٹس لیا اور مقتول کے گھر جاکر انصاف دلانے کی یقین دہانی بھی کرائی ہے۔ اب ہمارے سٹاف رپورٹر نے اطلاع دی ہے کہ مقتول کی والدہ کو مختلف افراد کی طرف سے فون کرکے کہا گیا ہے کہ وہ قتل کے عوض دیت لے کر مصطفیٰ کانجو کو معاف کردیں۔ اس کے ساتھ ہی دھمکی بھی دی جارہی ہے کہ دوسری صورت میں مزید کچھ کیا جاسکتا ہے، مقتول کی والدہ نے دھمکیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ثابت قدم رہنے کا اعلان کیا ہے۔ مقدمہ کے میرٹ پر بات کئے بغیر اپنے فاضل علماء کرام سے ایک سوال کی جسارت ہے کہ کیا حدود اللہ میں قتل کی سزا کے حوالے سے جو احکام ہیں اور دیت کی جو رعایت ہے اس میں یہی امر ہے کہ مقتول کے ورثا معاف کردیں تو قتل معاف اور ملزم بری ہوجاتا ہے؟ یا پھر دیت کے حوالے سے بھی کوئی شرائط ہیں، اس سلسلے میں علماء کرام کو رہنمائی فرمانا چاہئے، کئی بڑے مقدمات کے بارے میں پوچھا جاسکتا ہے، لیکن اس سے ابہام پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ سیدھا سوال یہ ہے کہ دیت کی وجہ اور دیت کی شرائط کیا ہیں، کیا ہر نوعیت اور ہر قسم کا قتل دیت کے عوض معاف ہوجاتا ہے؟ یا یہاں کچھ شرائط متعین کی گئی ہیں، کیونکہ اب تک تو کئی ایسے مجرم چھوٹ گئے ہیں جن کی سزائے موت کی توثیق ہوچکی اور وہ پھانسی پانے والے تھے، کیونکہ بعض معترض سوال کرتے ہیں کہ اس طرح تو ہر امیر اور بااثر شخص قتل کرکے بری ہوجایا کرے گا، کیونکہ ہمارے ملک میں حالات اور قوانین ایسے ہیں کہ یہاں مدّعی ملزم بن جاتا ہے۔ دیت کے حوالے سے تفصیلاً شرعی حیثیت بتانا اب علماء کرام کا فرض ہے۔''

طلوع اسلام ہر معاملہ میں رہنمائی کے لیے قرآنِ کریم کی طرف دیکھتا ہے۔ ذیل میں ہم سب سے پہلے ''دیت'' کے لفظ کو لغت کے اعتبار سے دیکھیں گے کہ اس کے معانی کیا ہیں۔ بعد ازاں ''قصاص'' کے لغوی معنی اور قرآنِ کریم سے اس سے متعلق رہنمائی حاصل کریں گے۔ سب سے پہلے دیکھتے ہیں کہ لغت کے اعتبار سے دیت سے کیا مراد ہے:

وَدَیٰ الشَّیْءُ وَدْیاً وہ چیز بہ پڑی۔ اَلْوَادِیْ۔ وہ جگہ جہاں پانی بہتا ہو۔ یہ اس کے اصل معنی ہیں۔ اس کے بعد دو پہاڑوں کے درمیان کشادہ زمین کو وادی کہنے لگے۔ اس کی جمع اَوْدِیَۃٌ آتی ہے (46/24)۔ پھر استعارۃً طریقہ، مسلک اور اسلوب کو بھی وَادٍ کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں فُلَانٌ فِیْ وَادٍ غَیْرِ وَادِیْكَ۔ فلاں آدمی تمہارے طریقہ سے جداگانہ طریقہ رکھتا ہے۔ قرآن کریم میں شاعروں کے متعلق کہا ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّھُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ (26/225)۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ وہ کس طرح ایک ایسے اونٹ کی طرح جسے پیاس کی بیماری بری طرح ستا رہی ہو اور اس کی کہیں تسکین نہ ہوتی ہو، مختلف خیالات کی وادیوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔

اَوْدَاہُ۔ اس نے اس کا خون بہا دیا۔ اسے ہلاک کر دیا اَوْدَی الرَّجُلُ۔ آدمی ہلاک ہو گیا ۔ یہیں سے اَلدِّیَۃُ اس مال کو کہتے ہیں جو مقتول کی جان کے عوض قاتل کی طرف سے مقتول کے ولی کو دیا جاتا ہے ۔ یعنی خون بہا (4/92)۔ (ماخوذ از لغات القرآن)

اب قصاص کی طرف آتے ہیں:

قَصَّ اَثَرَہٗ یَقُصُّ قَصّاً و قَصَصاً۔ کسی کے پیچھے پیچھے اس کے نقوش قدم پر چلنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا پیچھا کرنے اور جستجو کے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں دیکھئے (۶۴/۱۸، ۱۱/۲۸)۔

قَصَّ عَلَیْہِ الْخَبَرَ قَصصاً۔ اسے وہ خبر بتا دی۔ اسے اس پر مطلع کر دیا۔ قرآن کریم میں ہے۔ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ (12:3)۔ ہم تجھے بہترین انداز سے واقعات بتاتے ہیں۔ اَلْقَاصُّ۔ قصہ گو۔ ایک حدیث میں ہے اِنَّ بَنِیْ اِسْرَائِیلَ لَمَّا قَصُّوْا ھَلَكُوْا۔ بنی اسرائیل جب قصہ گوئی میں پڑ گئے تو ہلاک ہو گئے۔ یا جب انہوں نے (خدا کی سند کو چھوڑ کر) اسلاف کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا تو ہلاک ہو گئے۔ (یہی مسلمانوں کے ساتھ ہوا)۔ اَلْقِصَّۃُ۔ معاملہ۔ خبر۔ واقعہ۔

قَصَّ الشَّعْرَ۔ اس نے بال کاٹے۔ اَلْمِقَصُّ۔ قینچی کو کہتے ہیں۔

اَلْقِصَاصُ۔ مجرم کا اس طرح پیچھا کرنا کہ اسے اس کے جرم کی سزا مل کر رہے۔ مجرم کو اس کے جرم کی سزا دے دینا۔ قانون عدل کا مجرم کے پیچھے پیچھے چلنا۔ راغب نے اس کے معنی خون کے پیچھے خون بہا (بدلہ) کا آنا کئے ہیں۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو جرمِ قتل کی سزا کے سلسلہ میں استعمال کیا ہے۔ چونکہ یہ ایک اہم موضوع ہے اس لئے اس کے متعلق ہم ذرا تفصیل سے گفتگو کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

قرآن کریم کی رو سے انسانی زندگی کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ اس نے کہہ دیا کہ

مَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا۔ جس نے کسی متنفس کو مار ڈالا، بجز اس کے کہ اسے کسی جان کے بدلے (جرم قتل کی سزا میں) مارا گیا ہو یا ملک میں فساد برپا کرنے کی سزا کے طور پر، تو یوں سمجھو گویا اس نے تمام نوع انسان کو قتل کر ڈالا۔ وَمَنْ اَحْیَاھَا فَكَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا (5:32)۔ اور جس نے کسی ایک متنفس کو موت سے بچا لیا

تاج راغب محیط

تو اس نے گویا تمام انسانوں کو موت سے بچایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے

(۱) قتل بہت بڑا سنگین جرم ہے۔

(۲) جو شخص کسی دوسرے شخص کو قتل کر دے، یا ملک میں فساد برپا کر دے، اسے قتل کیا جا سکتا ہے۔

فساد فی الارض (بغاوت) کے متعلق (5:33) میں احکام دیئے گئے ہیں لیکن چونکہ یہ موضوع اس وقت زیر بحث نہیں اس لئے ہم اس سے آگے بڑھ کر انفرادی قتل کے جرم کی طرف آتے ہیں۔

جرم قتل کے متعلق پہلی آیت سورہ بقرہ میں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى (2:178)۔ ''تم پر مقتولین کے بارے میں قصاص فرض قرار دیا گیا ہے''۔ اس آیت میں لفظ قصاص سے مراد عام طور پر سزائے موت لی جاتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، قصاص کے معنی کسی کا پیچھا کرنے کے ہیں۔ لہٰذا قصاص کا مطلب ہوا مجرم کا پیچھا کرنا۔ اس کا تعاقب کرنا۔ اسے ایسے ہی نہ چھوڑ دینا کہ وہ اپنے کئے کی سزا نہ پا سکے۔ اس آیت میں خطاب يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (جماعت مومنین) سے ہے۔ جس معاشرہ میں اجتماعی قوانین رائج نہ ہوں، اس میں جرائم اور اس کے بدلے کو افراد پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی شخص نے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ اب یہ چیز مقتول کے وارثوں کے لئے ہے کہ وہ مجرم کا پیچھا کریں۔ اگر ان میں ہمت ہو تو اسے پکڑ کر اس سے بدلہ لے لیں۔ اور اگر مجرم ان سے بالا دست ہو تو پھر صبر شکر کر کے بیٹھ رہیں۔ لیکن قرآن کریم ایک اجتماعی نظام پیش کرتا ہے اس لئے اس میں جرم کا بدلہ لینا افراد پر نہیں چھوڑا گیا۔ وہ معاشرہ سے کہتا ہے کہ جرم کا ارتکاب خود معاشرہ کے خلاف ہوا ہے (کسی فرد کے خلاف نہیں ہوا) اس لئے یہ معاشرہ کا فریضہ ہے (نہ کہ مقتول کے وارثین کا انفرادی کام) کہ وہ مجرم کو کیفر کردار تک پہنچائے۔ معاشرہ پر فرض قرار دیا جاتا ہے کہ وہ مقتول کے بدلہ لینے کا انتظام کرے۔ دور حاضر کی اصطلاح میں کہا جائے گا کہ قرآن کریم نے جرم قتل کو ''قابل دست اندازی پولیس'' قرار دیا ہے جس میں مستغیث خود حکومت ہوتی ہے (Crown vs.....)۔ لہٰذا آیت کے اتنے ٹکڑے کے معنی یہ ہوئے کہ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جرم قتل کے مرتکب کا پیچھا کر کے اس سے بدلہ لے۔

اس سے آگے ہے اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ط۔ اس حصہ کا تعلق بھی سزا سے نہیں بلکہ اس میں اس اہم اصول کو بیان کیا گیا ہے کہ اس باب میں مجرم اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے۔ مجرم خواہ کتنا ہی بڑا اور مقتول کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، بدلے کے معاملہ میں دونوں کو یکساں سمجھا جائے۔ اس لئے کہ ہر انسانی زندگی (وہ مرد آزاد کی ہو یا غلام کی۔ عورت کی ہو یا مرد کی) یکساں قیمتی ہے۔

خونِ شہ رنگیں تر از مزدور نیست

اسے پھر دہرا دینا ضروری ہے کہ آیت کے اس حصے میں اسلام کا اصول مساوات بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اس سے یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی مرد آزاد (حُر) قتل کر دیا گیا ہے تو اس کے بدلے کسی مرد آزاد (حُر) کو قتل کیا جائے، خواہ قاتل کوئی غلام ہی کیوں نہ ہو اور اگر

مقتول غلام ہے تو کسی غلام کو پھانسی چڑھایا جائے' خواہ قاتل' مرد آزاد ہی کیوں نہ ہو۔ یہ مفہوم بالبداہت غلط ہے۔ قرآن کریم نے یہاں عام اصولِ مساوات پر زور دیا ہے اور اس کے لئے اصولی انداز بیان اختیار کیا ہے' جس سے مراد یہ ہے کہ سزا کے معاملہ میں قاتل اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی خیال نہ کیا جائے۔

اس کے بعد ہے فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ط۔ جس شخص کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے تو اسے چاہئے کہ قاعدے کے مطابق اس کی پیروی کرے اور حسن کارانہ انداز سے اس کی ادائیگی کرے۔ یہ تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ ظاہر ہے کہ سزا کا اس میں بھی ذکر نہیں۔ سزا میں سے کچھ معاف کر دینے کا ذکر ہے۔ ''کچھ معاف کر دینا''۔ (شئ) اس کی دلالت کرتا ہے کہ اس کا تعلق سزائے موت سے نہیں۔ اس لئے کہ سزائے موت میں سے ''کچھ معاف کر دینے'' (اور کچھ باقی رہنے دینے) کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ''کچھ معاف کر دینے'' کی شکل اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ سزا' مال (جرمانہ) کی ہو۔ اسے دیت یا خوں بہا کہا جاتا ہے۔

جرم قتل کی سزا کا ذکر سورہ نساء میں ہے جہاں جرم کی مختلف نوعیتوں اور ان کے مطابق سزا کا بیان ہے۔ ارشاد ہے وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَئًا۔ کسی مومن کے یہ شایان ہی نہیں کہ کسی دوسرے مومن کو قتل کر ڈالے۔ ہاں غلطی سے ایسا ہو سکتا ہے۔ وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَئًا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا۔ ''اور جو کوئی غلطی سے کسی مومن کو مار ڈالے تو ایک مومن غلام آزاد کرے اور خوں بہا ادا کرے جسے اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائے گا۔ بجز اس کے کہ وہ معاف کر دیں۔ یہاں سے بات صاف ہو گئی کہ قتل خطا (غیر ارادی طور پر' بھُولے سے قتل) کی سزا موت نہیں' بلکہ خوں بہا ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے گا۔ خوں بہا کی جو رقم عدالت مقرر کرے' مقتول کے وارثوں کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس میں سے کچھ (یا سب کا سب) معاف کر دیں۔ لہٰذا سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۸ میں جو فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ کہا گیا ہے تو وہ قتل خطا کی صورت میں ہے جس کی سزا خوں بہا ادا کرنا ہے۔

سورہ نساء کی آیت ۹۲ کے باقی ماندہ حصہ میں بتایا گیا ہے کہ اگر مقتول اس قوم سے متعلق ہو جو تمہاری دشمن ہو یا اس سے جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس صورت میں کیا سزا ہو گی (سزا اس صورت میں بھی خوں بہا ہی مقرر کی گئی ہے)۔

اس سے اگلی آیت میں ہے وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (4/93)۔ اور جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کر ڈالے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب ہے' اور اس کی لعنت اور اس کے لئے سخت سزا تیار کی گئی ہے''۔ یہاں قرآن کریم نے قتل عمد کے لئے انتہائی سزا بتائی ہے۔ اس میں دیت (خوں بہا) نہیں ہے۔ البتہ قتل عمد میں بھی جرم کی نوعیتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص نہایت ٹھنڈے دل سے سوچتا ہے کہ اگر فلاں آدمی کو قتل کر دیا جائے تو اس کی تمام جائیداد مجھے مل جائے گی۔ وہ اس کے لئے اسکیم بناتا ہے اور سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق اسے قتل کر دیتا ہے۔ اس قسم کے (Cold-Blooded Murder) کی سزا سخت ترین ہونی چاہئے۔ اس کے برعکس ایک شخص

دیکھتا ہے کہ کسی نے اس کی بیوی کی عصمت پر حملہ کیا ہے۔ وہ غیرت میں آ کر اسے فوراً قتل کر دیتا ہے۔ قتل عمد یہ بھی ہے لیکن اس میں اور اول الذکر میں بڑا فرق ہے۔ اس لئے ہر قتل عمد کی سزا ایک جیسی نہیں ہوگی۔ جرم کی نوعیت اور احوال وظروف (Circumstances) کے اختلاف سے سزا میں اختلاف ہوگا۔ اس سے قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ قرآن کریم نے قتل عمد کی سزا میں فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ کے بعد اللہ کا غضب۔ اس کی لعنت۔ اور سخت سزا کا جو ذکر کیا ہے تو یہ سزاؤں کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ مثلاً عبور دریائے شور۔ قید تنہائی۔ قید بامشقت۔ معاشرہ کے حقوق سے محروم (Disqualify) کر دینا (لعنت کے یہی معنی ہیں) وغیرہ وغیرہ۔

ممکن ہے کہہ دیا جائے کہ یہاں سزائے جہنم کا ذکر ہے (جس کا تعلق آخرت سے ہے اس دنیا سے نہیں)۔ لیکن دوسری جگہ قرآن کریم نے اس کی صراحت کر دی ہے کہ قتل عمد کی سزا بالعموم موت (قتل) ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ۔ جس جان کا مارنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے (یعنی بے گناہ کا قتل) اسے قتل مت کرو۔ بجز اس کے کہ انصاف کا تقاضا ایسا ہو۔ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا۔ جو ظلم سے قتل کیا جائے تو قاتل یہ نہ سمجھے کہ مقتول کے وارثوں کا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں' اس لئے میں اب جس طرح جی چاہے دندناتا پھروں' مجھے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ اسے اس زعم باطل میں نہیں رہنا چاہئے۔ مقتول کے ورثاء کے لئے ہم نے معاشرہ کو ''سلطان'' بنایا ہے۔ معاشرہ (نظام حکومت) کا غلبہ واقتدار (سلطان) مقتول کے وارثوں کا پشت پناہ ہوگا۔ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (17:33)۔ اس طرح یہ معاشرہ خود مقتول کی (اور اس کے وارث کی) مدد کرے گا اور قاتل سے بدلہ لے کر چھوڑے گا۔ لیکن معاشرہ کو اس کی بھی تاکید کر دی گئی ہے کہ قاتل کو سزائے موت دینے میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ۔ مثلاً ایک شخص نے جان بوجھ کر کسی شخص کے خاندان کے چار پانچ افراد کو بے رحمی سے قتل کر دیا ہے۔ (ظاہر ہے کہ اثبات جرم کے بعد عدالت کو قاتل کے خلاف سخت غصہ ہوگا۔ لیکن عدالت کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ قاتل کے خاندان کے چار پانچ افراد کو اسی طرح قتل کر دے۔ یہ ''اِسْرَافٌ فِي الْقَتْلِ'' ہوگا۔

نہ ہی آیت کے اس ٹکڑے (فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا) کے یہ معنی ہیں کہ مقتول کے وارث کو اس کا اختیار ہے کہ وہ جا کر قاتل کو خود قتل کر دے۔ بالکل نہیں۔ قصاص کا حکم معاشرہ کے لئے ہے افراد متعلقہ کے لئے نہیں۔ قتل کا جرم' معاشرہ (نظام حکومت) کے خلاف جرم ہے۔ انفرادی جرم نہیں۔ مقتول کے وارثوں کی حیثیت (زیادہ سے زیادہ) استغاثہ کے گواہوں کی ہوگی۔ مستغیث کی نہیں ہوگی۔ مستغیث خود حکومت ہوگی۔ لہٰذا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ کا حکم بھی معاشرہ (عدالت) کے لئے ہے۔

اس آیت سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔

(۱) وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا سے واضح ہے کہ یہاں قتل عمد کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ قتل خطا میں قاتل کو ظالم اور مقتول کو مظلوم نہیں کہا جائے گا۔ جس شخص سے محض سہواً' نادانستہ' بھول چوک میں' غلطی سے کسی کا قتل ہو جائے وہ ظالم نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنے کئے پر خود نادم ہوتا ہے۔ لہٰذا مقتول اسی صورت میں مظلوم کہلائے گا جب اسے کسی نے عمداً قتل کیا ہو۔

(۲) معاشرہ کے طاقتور لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ اپنی قوت کے بل بوتے پر جسے چاہیں قتل کر ڈالیں۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ معاشرہ کا پورا غلبہ واقتدار (سلطان) مقتول کے وارث کا پشت پناہ ہوگا' اور اس طرح قاتل سے بدلہ لینے میں اس کا حامی و

مددگار رہے گا۔

(۳) قتل عمد کی سزا قتل (موت) ہے۔لیکن اس میں حد سے نہیں بڑھا جائے گا۔

اس آیت کو جب سورہ نساء کی آیت فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ سے ملا کر پڑھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہاں جہنم کی سزا سے مراد سزائے موت ہے۔اور ''اللہ کا غضب ولعنت اور عذاب عظیم'' وغیرہ اس کے ساتھ' یا اس سے الگ' یا اس سے نچلے درجہ پر' دوسری سزائیں ہیں جن کی نوعیت معاشرہ خود متعین کرے گا۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے:

(i) قتل کا جرم انسانیت کے خلاف سنگین جرم ہے۔

(ii) جرم قتل' افراد کے خلاف جرم نہیں خود معاشرہ کے خلاف جرم ہے۔لہٰذا' مجرم کا پیچھا کر کے اسے سزا دینا' مقتول کے وارثوں کا کام نہیں بلکہ نظام حکومت کا فریضہ ہے۔

(iii) اس بات کا فیصلہ عدالت کرے گی کہ قتل بلا ارادہ (خطا) تھا یا قتل عمد۔

(iv) قتل خطا کی صورت میں سزا خوں بہا (دیت) ہوگی۔اس کے لئے مقتول کے وارثوں کو اختیار ہوگا کہ وہ مجرم کو بالکلیہ معاف کر دیں یا خوں بہا کی رقم میں سے کچھ کم کر دیں۔

(v) قتل عمد کی سزا دیت نہیں اس لئے اس میں مقتول کے وارثوں کا کوئی اختیار نہیں رہتا۔اس کی سزا عدالت کی طرف سے مقرر ہوگی جو سزائے موت (یا جرم کی نوعیت اور حالات کے پیش نظر) اس سے کم درجہ کی سزا (قید وغیرہ) ہوگی۔

(vi) یہ جو کہا گیا ہے کہ ''کسی مومن کے شایان شان نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کر دے۔مگر غلطی سے''۔تو اس کے یہ معنی نہیں کہ مومن غیر مومنوں کو یونہی قتل کرتا پھرے۔اس کی اسے کھلی چھٹی ہے' قطعاً نہیں۔مومن وغیر مومن کسے باشد' ہر ایک کی زندگی قرآن کریم کی رو سے یکساں قیمتی ہے (5:32)۔اس آیت میں مومنین کی اس خصوصیت کا ذکر ہے کہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ایک بھائی کو یہ زیب ہی نہیں دیتا کہ وہ دوسرے بھائی کو قتل کر دے۔ہاں ایسا غلطی سے ہو سکتا ہے۔اس صورت میں اسے خوں بہا ادا کرنا ہوگا تا کہ آئندہ ایسی غلطی سے محتاط رہے۔لیکن اگر کوئی مومن کسی دوسرے مومن کو عمداً قتل کر دے تو اس کی سزا سخت ہوگی۔

(vii) قرآن کریم نے انسانی زندگی کی قدر و قیمت اور اہمیت بتانے کے باوجود اسے تسلیم کیا ہے کہ بالحق زندگی لی جا سکتی ہے۔یعنی جہاں حق و انصاف کا تقاضا ہو' یعنی بے گناہ کے قتل عمد کی سزا کے طور پر' یا دشمن سے جنگ میں' یا نظام اسلامی کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو فساد سے روکنے کے لئے' وغیرہ۔لیکن اس کا فیصلہ بھی معاشرہ کرے گا (نہ کہ افراد از خود) کہ بالحق کسے قتل کیا جا سکتا ہے۔لہٰذا مقتول مظلوم کے وارثوں کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ از خود قاتل کو قتل کر دیں۔یہ ہے وہ **قصاص** جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس میں تمہاری اجتماعی زندگی کا راز پوشیدہ ہے (2:179)۔

(ماخوذ از لغات القرآن)

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

قسط سوم

پرویز صاحب کا نظریۂ اجتہاد (فقہ)

(قانون سازی)

قانون سازی کا اہم ترین کام، ہر دور میں، بدلتے حالات اور ضروریات کے پیشِ نظر، قرآن کریم کی حدود میں رہتے ہوئے، پوری امت کی مشاورت سے جاری رہے گا۔ مشاورت کا طریقہ کار بھی پوری امت کی مشاورت سے وضع اور طے کیا جائے گا۔ انفرادی یا اجتماعی (گروہی) تدبر و تحقیق کو صرف تجاویز کی حیثیت حاصل ہوگی۔ قانون سازی کا اختیار کسی ایک فرد، گروہ، جماعت پارٹی یا فرقہ کو حاصل نہیں، یہ پوری امت (یعنی اسلامی مملکت) کا کام ہے۔

فقہ:۔ طلوعِ اسلام مئی جون ۱۹۸۲ء صفحہ نمبر ۳۸:۔ ''مختصر الفاظ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ فقہ کسے کہتے ہیں اور یہ کیسے وجود میں آئی۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ عہدِ عباسیہ میں، احادیث کو اس لئے جمع اور مرتب کیا گیا کہ ان کے ذریعے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا فریضہ ادا کیا جا سکے۔ لیکن اس زمانے تک زندگی کے تقاضے اس قدر بڑھ چکے تھے کہ احادیث کی رو سے تمام مسائل کا حل مل نہیں سکتا تھا۔ اور اگر ملتا بھی تو احادیث کے عین مطابق عمل کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس دشواری کے پیشِ نظر بعض مقننین نے سوچا کہ اسلام کو بہ ہیئتِ مجموعی سامنے رکھ کر، اپنے غور و تدبر (تفقہ) کی رو سے ان مسائل کا حل مستنبط کیا جائے۔ ان کے اس طرح وضع کردہ قوانین کو ''فقہ'' کہا جاتا ہے۔ اور فقہی احکام کی پیروی کو ''خدا اور رسول کی اطاعت'' قرار دے دیا جاتا ہے۔ جب استنباطِ مسائل کی یہ طرح پڑی تو فقہی قوانین کے بکثرت مجموعے مرتب ہو گئے۔ (ان ائمہ فقہ کی تعداد تو بہت زیادہ تھی لیکن) ان میں سے چار نے زیادہ شہرت حاصل کی تھی۔ (یعنی۔

(۱)۔ امام اعظمؒ۔ ابو حنیفہؒ (کوفی) پیدائش۔ ۸۰ھ وفات۔ ۱۵۰ھ
(۲)۔ امام مالکؒ۔ (یمنی)۔ پیدائش۔ ۹۳ھ وفات۔ ۱۷۹ھ
(۳)۔ امام شافعیؒ (عسقلانی۔ مکی) پیدائش۔ ۱۵۰ھ وفات۔ ۲۰۴ھ
(۴)۔ امام احمد بن حنبلؒ (بغدادی) پیدائش۔ ۱۶۴ھ وفات۔ ۲۴۱ھ

یہ سُنی حضرات کے ائمہ ءفقہ ہیں۔شیعہ حضرات کی فقہ جعفری الگ ہے۔سنیوں میں اہلِ حدیث کا الگ فرقہ ہے جو کسی فقہ کے قائل نہیں۔وہ براہِ راست حدیث پر عمل کرنے کے قائل ہیں۔ہم دیکھ چکے ہیں کہ احادیث، جامعینِ حدیث کے قیاس کی رو سے منتخب ہوئیں، اور فقہ،فقہاء کے قیاس کا نتیجہ ہے۔لیکن ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ''اطیعوااللہ واطیعواالرسول'' کا ذریعہ یہی احادیث یا فقہ ہیں۔معتقدینِ حدیث کا عقیدہ ہے کہ حدیث،قرآن کی مثل ہے(مثلہٗ معہٗ) بلکہ یہ قرآن کو منسوخ بھی کرسکتی ہے۔اسی طرح فقہ حنفیہ کے ایک مسلّم امام ابوالحسن عبیداللہ الکرخیؒ کا قول ہے کہ:۔ ہر وہ آیت جو اُس طریقہ کے خلاف ہو جس پر ہمارے اصحاب (ائمہ ءفقہ) ہیں، یا تو منسوخ ہے یا منسوخ۔اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو، وہ مئول ہے یا منسوخ۔(تاریخ التشریع الاسلامی۔مئولفہ علامہ محمد الخضری۔اردو ترجمہ۔تاریخ فقہ اسلامی۔شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔صفحہ نمبر ۴۲۱)۔ان حضرات کے نزدیک، دین، فقہ میں تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔اب فقہ میں نہ مزید تحقیق وتفتیش یا اجتہاد کی ضرورت ہے نہ ان احکام میں کسی قسم کا ردوبدل ہوسکتا ہے۔قرآن کریم نے یہ خصوصیت کلمات اللہ (احکام وقوانینِ خداوندی) کی بتائی تھی کہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ فقہ بھی مثلِ قرآن:۔جبکہ انسانوں کے وضع کردہ ان احکام (فقہی قوانین) کو ابد تک غیر متبدل قرار دے کر،انہیں قوانین خداوندی کا ہم پایہ بنا دیا گیا۔یہ ہمارا قیاس نہیں ان حضرات کا عقیدہ ہے کہ فقہی احکام،قرآن کی مثل ہیں۔فقہ حنفی میں ''الہدایہ'' معتبر ترین کتاب ہے۔اس کی جلد اوّل کے مقدمہ میں کہا گیا ہے کہ ''الہدایہ کاالقرآن'' (بحوالہ ہفت روزہ اہلِ حدیث،مورخہ :۱۲۔فروری ۱۹۸۲ء)۔ان تصریحات کی روشنی میں آپ اس نکتہ پر غور کیجئے جو ہمارا بنیادی موضوعِ گفتگو ہے۔جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں (شیعہ فرقہ کو چھوڑ کر) سنیوں کے ہاں احادیث کے چھ مجموعے ہیں جنہیں صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔ان میں جو روایات آگئی ہیں وہ غیر متبدل ہیں۔اس کے بعد فقہ کے (کم ازکم) چار ائمہ کی طرف منسوب،قوانین ہیں جو غیر متبدل سمجھے جاتے ہیں۔کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ ان کے متبعین اپنے اختلافات چھوڑ کر،اُمتِ واحدہ بن جائیں!۔''

ائمہ فقہاء:۔ طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۸۲ء۔صفحہ نمبر ۴۹:۔دورِ ملوکیت میں ''جہاں تک شخصی قوانین کا تعلق ہے چونکہ ان کی تدوین وتنفیذ کے لئے کوئی مرکزی اتھارٹی نہیں تھی،اس لئے مختلف فقہاء نے اپنے اپنے طور پر قوانین مرتب کر لئے۔اور ان کے معتقدین نے ان قوانین کا اتباع اپنے اوپر لازم قرار دے لیا۔اس طرح اُمتِ واحدہ،فرقوں میں بٹ گئی۔'''' شروع شروع میں تو ان ائمہ فقہاء کے متبعین اپنے اجتہاد سے ایسے مسائل بھی وضع کرتے تھے جو ان کے پیشروؤں کے خلاف ہوں۔نیز ان کے مرتب کردہ مسائل کی فہرست میں حک واضافہ بھی کرتے رہتے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ختم ہوگیا اور عقیدہ یہ پیدا ہوگیا کہ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ کسی مسئلہ میں ایسی بات کہے جو اس قول کے خلاف ہو جس کا فتویٰ اس کے امام نے دیا ہے۔(فقہاء حنفیہ کے پیشوا، الکرخیؒ کا قول اوپر پیش کیا جاچکا ہے۔مئولف)۔اجتہاد کا دروازہ بند کردینے کے بعد اُس وقت تک کے دیئے گئے فتاویٰ کو کتابی شکل میں مرتب کردیا گیا۔ان مجموعوں کا نام فقہ ءحنفی ہے۔واضح رہے کہ یہ فقہ امام ابوحنیفہؒ کی مرتب کردہ نہیں۔یہ حنفی مسلک کے مختلف فقہاء کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔انہی فتاویٰ کا ایک جامع مجموعہ شہنشاہ عالمگیرؒ کے زمانے میں مرتب کیا گیا جو فتاویٰ عالمگیری کے نام سے مشہور

ہے۔ مذہب کی حیثیت سے (یعنی دینی حیثیت سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے) ان فقہی احکام کی ایک اہمیت ضرور تھی اور وہ یہ کہ کم از کم ایک فقہ کے مقلد ایک مسلک سے منسلک رہتے تھے۔ لیکن اسے دینی حیثیت تو کسی صورت میں بھی نہیں دی جاسکتی۔ دین کا تمکن تو اُسی دن ختم ہوگیا تھا جب قرآنی نظامِ مملکت باقی نہ رہا تھا۔۔۔

درجہء الوہیت:۔ دینی نقطہء نگاہ سے اس میں ایک اور بنیادی خرابی تھی، اور وہ یہ کہ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو درجہء الوہیت دے دیا گیا۔ (ائمہء فقہ کی تقسیئنی قابلیت مسلّم۔ ان کا تقویٰ اور دیانت بھی شک وشبہ سے بالا سہی لیکن اس کے باوجود وہ تھے تو انسان ہی۔ انہیں مقامِ انسانیت سے بلند تصور کر کے الوہیت کے درجہ پر سرفراز کر دینا شرک ہے)۔ یہ نکتہ غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ قوانینِ خداوندی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ یہ حیثیت انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو دے دی جائے تو یہ انہیں خدائی حیثیت دے دینے کے مرادف ہوگا۔ قرآن کریم نے سابقہ اہلِ کتاب کے خلاف جو یہ اعتراض کیا ہے کہ: اتخذ وا احبارھم ورھبانھم اربابًا من دون اللہ۔۔ (۹/۳۱)۔ کہ وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کو خدائی درجہ دے دیتے تھے تو اس سے یہی مراد ہے کہ وہ ان کے وضع کردہ قوانین کو خدائی قوانین جیسا درجہ دے دیتے تھے۔

شرک:۔ اور یہ کھلا ہوا شرک تھا۔ قرآن کریم نے اُمت میں فرقوں کے وجود کو شرک قرار دیا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے (۳۰/۳۱)۔ فرقے کا وجود اس عقیدہ پر قائم ہوتا ہے کہ اس کے متبعین اپنے فرقے کے بانیوں کے وضع کردہ عقائد واحکام کو منفرد، ابدی اور غیر متبدل سمجھتے ہیں۔ کوئی دس سال اُدھر کی بات ہے کہ ہمارے ہاں یہ خیال اُبھرا کہ مروّجہ اسلامی احکام کے متعلق کچھ تحقیقاتی کام کیا جائے۔ اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے مفتی جمیل احمد تھانوی نے ارشاد فرمایا کہ:۔ ۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق وتفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایہء تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اسی کا نام فقہء اسلامی ہے جو ائمہء ھدیٰ کی تحقیقات کا مجموعہ ہے۔۔۔ لہٰذا، اگر تحقیقاتِ اسلامی سے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور تنقیح شدہ موجود ہیں تو موجودہ دور کی تحقیق، اگر اس کے مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے اور اگر وہ تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر اُمتِ محمدیہ ﷺ کا اجماع ہے۔ (بحوالہ۔ ایشیاء۔ ۴۔ اگست ۱۹۶۸ء)۔ یہ ہے فقہی قوانین کے متعلق وہ عقیدہ جو مسلسل چلا آرہا ہے۔''

جمودِ فقہ:۔ طلوعِ اسلام نومبر ۱۹۸۴ء۔ ص۔ ۲۴:۔ ''صدرِ اول کی اسلامی مملکت کا طریقِ کار یہ تھا کہ قرآن کریم نے جو احکام اور قوانین متعین طور پر دیئے تھے، وہ انہیں نافذ کرنے کے طرق واسالیب طے کرتی تھی۔ اور جو احکام، اصول واقدار کی شکل میں دیئے تھے، وہ اپنے زمانے کے حالات واقتضادات کے مطابق ان کی جزئیات (بائی لاز) متعین کرتی تھی۔ یہ سب کچھ امت کے مشورے سے طے پاتا تھا۔ دورِ ملوکیت میں نہ قرآن (کا نظام) باقی رہا تھا نہ امت کا نظامِ مشاورت۔ اس میں بادشاہ کا حکم قانون کی حیثیت اختیار کر لیتا تھا جس پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جاسکتی تھی۔ جہاں تک امورِ شریعت کا تعلق ہے، مذہبی پیشوائیت نے ان کے متعلق قوانین وضع کرنے کا فریضہ اپنے ذمہ لیا۔ قانون سازی کی مہارت رکھنے والے فقہاء (قانون دانوں) نے قوانین وضع کئے۔ انہیں

فقہی قوانین کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کے قوانین کی بنیاد احادیث پر ہے۔ چونکہ احادیث میں اختلاف تھا اس لئے ان فقہی قوانین میں بھی اختلاف تھا۔ ان فقہاء کی تعداد تو بہت تھی لیکن ان میں چار نے زیادہ شہرت حاصل کی۔ یعنی امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام مالک (رحم اللہ تعالیٰ)۔ ان کی فقہیں متداول چلی آرہی ہیں (اور امت میں تفرقہ کا ایک موجب یہ بھی ہیں)۔ شروع میں تو ان میں افہام وتفہیم کی گنجائش تھی لیکن ان کی بنیادوں پر مختلف فرقے وجود میں آگئے تو یہ سب فقہیں اپنی اپنی جگہ محکم اور غیر متبدل قرار پا گئیں۔ آہستہ آہستہ یہ عقیدہ بھی قائم ہوگیا کہ ہر فرقہ کی فقہ اپنی جگہ غیر متبدل اور ابدی ہے۔ یعنی اس میں نہ کسی قسم کا ردوبدل ہوسکتا ہے نہ حک واضافہ۔ جب فقہاء نے یہ قوانین مرتب کئے تھے تو انہوں نے اپنے زمانہ کے حالات کے تقاضوں کو مدِنظر رکھ کر، غور وتفکر کی رو سے، انہیں وضع کیا ہوگا۔ لیکن جب یہ طے پا گیا کہ ان میں نہ ردوبدل ہوسکتا ہے نہ حک واضافہ، تو سوچ بچار اور غور وفکر خارج از بحث ہوگئے۔ بطور اصطلاح اب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ جس قدر اجتہاد کیا جانا مطلوب تھا، اسلاف اسے کر چکے ہیں۔ اب انہی کے فیصلے قولِ فیصل اور حرفِ آخر تسلیم کئے جائیں گے۔''

فکر منجمد ہوگئی:۔ طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۸۵ء۔ ص۔ ۸:۔ ''جب اسلام، دین کی شکل میں قائم تھا تو اس میں اسلامی نظام کا یہی نقشہ تھا۔ یعنی خدا کی مقرر کردہ اقدار (حدود) کے اندر رہتے ہوئے فکر کی کارفرمائی۔ اس کے بعد، جب اسلام، مذہب میں تبدیل ہوگیا تو اس کی رو سے:۔ (۱)۔ انسانی فکر، اس زمانے کی سطح پر پہنچ کر جامد ہوگئی، جس زمانے میں دین، مذہب میں تبدیل ہوا تھا۔ اور۔ (۲)۔ اس کے ساتھ ہی اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا اور انسانی فکر نے جو احکامِ شریعت اس زمانے میں وضع کئے تھے، انہیں ابدی اور غیر متبدل قرار دے دیا گیا۔ انہیں فقہی احکام کہا جاتا ہے۔ یہ تبدیلی، بہ حیثیتِ مجموعی، عباسیوں کے دورِ ملوکیت میں رونما ہوئی تھی۔ ان احکام پر ملوکیت کی چھاپ کا لگنا ناگزیر تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک، یہ قوم، دنیاوی (کائناتی) اور اخروی (اقدارِ خداوندی) دونوں امور سے متعلق، اسی مقام پر کھڑی ہے جہاں اس کی فکر مفلوج اور جامد ہوئی تھی۔ اب اسلامی اور غیر اسلامی کا معیار یہ ہے کہ جو معتقدات اور نظریات، یا احکام وشعائر، اُن معتقدات واحکام کے مطابق ہوں، جو اُس زمانے میں رائج تھے، انہیں اسلامی قرار دیا جاتا ہے۔ جو ان سے مختلف ہوں، انہیں غیر اسلامی۔ یعنی اب اسلام، اقدار واصولِ خداوندی کی حدود کے اندر زندگی بسر کرنے کا نام نہیں، ان عقائد کا معتقد اور اُن احکام کا پیرو ہونے کا نام ہے جو ملوکیتِ عباسیہ کے زمانے میں وضع ہوئے یا رائج تھے۔ اسے فقہی مسلک کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں اس نکتہ پر غور کیجئے کہ فقہ (تفقہ) کے معنی غور وفکر کرنا ہیں لیکن اب فقہی احکام انہیں کہا جاتا ہے جن میں غور وفکر حرام ہے۔''

شخصیت پرستی:۔ طلوعِ اسلام اگست ۱۹۸۱ء۔ صفحہ نمبر ۴۹:۔ ''فقہ کے احکام، انسانوں کے مرتب کردہ تھے۔ وہ حضرات (فقہاء) کتنے ہی بلند مرتبہ بزرگ اور ماہرین قوانین کیوں نہ ہوں، لیکن تھے تو بالآخر انسان ہی۔ اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے قوانین (کلمات اللہ) کو غیر متبدل قرار دیا ہے (۶/۱۱۶)۔ لہٰذا، انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل قرار دینا، انہیں خدائی درجہ دے دینا ہے جو بالبداہت شرک ہے۔ قرآن کی بنیادی حقیقت یہ بھی ہے کہ اس نے شخصیتوں کو ختم کر کے، صرف خدا کی حاکمیت کو باقی

رکھا۔ دیکھئے! وہ کس قدر واشگاف الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے جب کہتا ہے کہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹)۔ ''کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔۔۔خواہ اسے مقننہ کے اختیارات حاصل ہوں اور خواہ انتظامیہ کے۔حتیٰ کہ وہ نبی کیوں نہ ہو۔کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم اس کتاب کی محکومیت اختیار کر کے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو،اور جس پر تم غور و خوض کرتے ہو،اللہ والے بن جاؤ'' انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو ابدی (غیر متغیر) قرار دینے میں عملی نقص یہ ہے کہ ہزار سال پہلے کے زمانے کے حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے وضع کردہ قوانین، اُس زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوں تو کرتے ہوں، ہزار سال بعد کے زمانے کے تقاضوں کو کبھی پورا نہیں کر سکتے۔وہ اس قدر بدلے ہوئے ماحول میں فٹ ہی نہیں بیٹھ سکتے۔انسانوں کے وضع کردہ قوانین کا تجربہ تو ہم نت نئے دن کرتے رہتے ہیں۔مسودہء قانون بڑے غور و فکر کے بعد مرتب ہوتا ہے۔پارلیمان میں سینکڑوں اراکین کے اجلاس میں وہ معرضِ بحث بنتا ہے۔دو دو تین تین دفعہ اسے دہرایا جاتا ہے۔اس میں کئی ترامیم کی جاتی ہیں۔حکومت میں ماہرینِ قانون کا ایک خاص شعبہ اس کے ایک ایک لفظ کی چھان بین کرتا ہے۔اتنی چھلنیوں میں سے چھننے کے بعد، وہ آخری شکل اختیار کرتا ہے۔لیکن ہنوز وہ پریس میں ہوتا ہے کہ اس کی ترمیم شائع کرنی پڑ جاتی ہے۔یہ ہے انسانی قانون سازی کی کیفیت!۔ہزار سال پہلے تو قانون سازی کے سلسلہ میں اس قدر اہتمامات کا تصور تک نہیں تھا۔لہٰذا، اس زمانے کے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو ابدی طور پر غیر متبدل قرار دے دینا،عقیدت مندانہ جذبات کی تسکین تو کر سکتا ہے،عملی زندگی میں ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ابتدائی فقہی قوانین سے اختلاف قابلِ اعتراض نہیں تھا۔علّامہ اقبال کی تحقیق کی رو سے، چوتھی صدی ہجری کے آغاز تک،قریب انیس مختلف مراکزِ فقہ وجود میں آ چکے تھے (یہ اُس زمانے کی بات ہے جب اُمت کی مرکزیت (خلافت علیٰ منہاج رسالت) ختم ہو چکی تھی۔مرکزیت کے زمانے میں انفرادی فقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا، جیسے آج بھی کسی باضابطہ حکومت کی موجودگی میں انفرادی قانون سازی کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا) ان میں سے متعدد (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ) اب بھی باقی ہیں۔لیکن بعد میں جب، اسلاف کے مسلک کو ''دین'' بنا دیا گیا اور فکر پر پہرے بٹھا دیئے گئے، تو ہر فرقہ نے اپنی فقہ کو محفوظ اور مستحکم رکھنے کے لئے، اسے مقدس بنا دیا اور اس سے ذرا سے اختلاف کو خلافِ اسلام قرار دے دیا۔۔آپ شاید دل میں سوچتے ہوں کہ جب اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ ان قوانین کے واضعین بہر حال انسان تھے، تو ان کے وضع کردہ قوانین کو یہ حیثیت دی کیسے گئی؟۔یہ کیسے ہو گیا؟۔یہ نقطہ واقعی اہم ہے اور گہرے غور و فکر کا محتاج!۔انہیں یہ حیثیت اس طرح حاصل ہو گئی کہ ان کے متعلق کہا گیا کہ یہ قوانین اُن فقہاء کے خود وضع کردہ نہیں بلکہ نبی اکرم ﷺ کے ارشادات (احادیث) پر مبنی ہیں۔لہٰذا، ان قوانین سے اختلاف یا ان کا انکار، احادیث یا سنتِ رسول اللہ ﷺ سے انکار کے مرادف ہے۔اور یہ کفر ہے۔ان قوانین کی حضور ﷺ کی طرف نسبت سے، اب سوال فکر سے متعلق نہ رہا، جذبات سے وابستہ ہو

گیا۔ اور جو سوال، جذبات سے وابستہ ہو جائے، اس کی تقدیس، تنقید کی حد سے ماوراء ہو جاتی ہے۔ یہ مقام بڑا نازک ہوتا ہے۔ عزت بخاری کے الفاظ میں:۔ ع:۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

نتیجہ اس کا یہ کہ جونہی کسی نے کسی فقہی فیصلہ سے اختلاف کیا، یا اس پر اعتراض کیا، اس کے متعلق مشہور کر دیا کہ وہ منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ سنتِ رسول ﷺ ہے۔ اس سے عوام کے جذبات جس قدر مشتعل ہو سکتے ہیں، ظاہر ہے۔ یہ ہے وہ ٹیکنیک جس سے فقہی عقائد و احکام کو تنقید سے بالا تسلیم کرایا جاتا ہے۔''

یہ شرک ہے:۔ ''انسانوں کو خدا کا ہمسر بنانا۔ ان کے فیصلوں کو خدائی شریعت قرار دینا، کھلا ہوا شرک ہے۔ فرمایا:۔ اَمۡ لَهُمۡ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوۡا لَهُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا لَمۡ يَاۡذَنۡ بِهِ اللّٰهُ (۴۲/۲۱)۔ ''کیا انہوں نے خدا کے شریک ٹھہرا رکھے ہیں جو ان کے لئے احکامِ شریعت وضع کرتے ہیں۔ حالانکہ خدا نے ایسا کرنے کی کہیں اجازت نہیں دی۔'' یہی ہیں وہ لوگ جو خدا پر ایمان رکھنے کے دعویدار ہونے کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں:۔ وَ مَا يُؤۡمِنُ اَكۡثَرُهُمۡ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمۡ مُّشۡرِكُوۡنَ (۱۲/۱۰۶)۔ خدا کے ساتھ انسانوں کو شریک کرنے والوں کے متعلق وہ کہتا ہے:۔ اَوَلَمۡ يَكۡفِهِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ يُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَرَحۡمَةً وَّذِكۡرٰى لِقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ (۲۹/۵۱)۔ ''(اے رسول ﷺ!) کیا ان کے لئے کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف یہ کتاب نازل کی ہے، جس میں، ان لوگوں کے لئے جو اس کے خود مکتفی ہونے پر ایمان رکھتے ہیں، سامانِ شرف و رحمت ہے۔''

امام ابوحنیفہؒ کا مسلک:۔ اسی سلسلہ میں طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۷۱ء (صفحہ نمبر ۵۰۔۴۲) میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کو اس بات پر خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے کہ انہوں نے، قرآن کریم کی غیر متبدل حدود میں رہتے ہوئے، زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر (قابلِ تغیر و تبدل) قانون سازی کا طریقہ اختیار فرمایا جسے انہوں نے ''استحسان'' کا نام دیا۔ پرویز صاحب کہتے ہیں:۔ ''خلافتِ راشدہؓ کے بعد، اسلامی حکومت کا یہ نقشہ باقی نہ رہا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی نظام کا وہ اصول جس کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے (یعنی اگر حالات متقاضی ہوں تو اسلامی نظام کی رو سے، ایک اسلامی حکومت کے فیصلے، بعد میں آنے والی حکومت تبدیل بھی کر سکتی ہے اور ان میں حک و اضافہ بھی، بشرطیکہ یہ تبدیلیاں قرآن کے غیر متبدل اصول و اقدار سے ٹکرائیں نہیں)، اربابِ فکر و نظر کے سامنے نمایاں طور پر رہا۔ اس ضمن میں ہمارے سامنے، ملتِ اسلامیہ کے مقننِ اعظم، امام ابوحنیفہؒ کی مثال متمیز طور پر آتی ہے۔ جہاں تک اسلامی قوانین و ضوابط پر تفقہ و تدبر کا تعلق ہے، امام صاحب کا مقام بہت بلند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فکر و تدبر کی

منفرد صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ آپ کا مسلک یہ تھا کہ دین کی اساس و بنیاد، قرآن کریم اور فکرِ انسانی پر ہے۔ جو کچھ قرآن کریم میں کہا گیا ہے، اس کی روشنی میں، اپنے زمانے کے مسائل کا حل، غور و تدبر سے خود دریافت کرنا چاہیئے۔ اسے وہ اجتہاد یا تفقہ سے تعبیر کرتے تھے۔ جو لوگ آپ سے متفق نہیں تھے، وہ آپ کے اس مسلک کو ''قیاس'' قرار دے کر، اس کی مذمت کرتے تھے۔ اس حد تک مذمت کہ وہ آپ سے کہتے تھے کہ:۔ اول من قاس ابلیس۔ فلاتقس۔ سب سے پہلے جس نے قیاس سے کام لیا تھا وہ ابلیس تھا، لہٰذا، تم ایسا نہ کرو۔ اس کے جواب میں امام صاحب فرماتے تھے کہ:۔ ''میں جو کچھ کہتا ہوں وہ قیاس نہیں، وہ تو قرآن کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:۔ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (۶/۳۸) ہم نے کتاب میں کسی بات کو بھی چھوڑا نہیں۔ لہٰذا، جو کچھ میں کہتا ہوں وہ ان لوگوں کے نزدیک قیاس ہے جنہیں خدا نے فہمِ قرآن کی نعمت سے نہیں نوازا۔'' (کتاب المیزان)۔ امام صاحب اپنی عقل و فکر کی روشنی میں، قرآن کریم سے استنباطِ مسائل کرتے تھے اور سابقہ ادوار کے فیصلوں کو نظائر (Precedents) سے تعبیر کرتے تھے جن سے، معاملات کے فیصلے کرنے میں، استفادہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ انہیں ہر زمانے میں مِن و عَن نافذ کیا جائے۔ ان کے نزدیک، عہدِ رسالت مآب ﷺ اور خلافتِ راشدہ کے فیصلوں کی بھی یہی حیثیت تھی۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں، بہت سی مثالیں درج کی ہیں جن سے امام صاحبؒ کا مسلک واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً یوسف بن اسباط سے ابو صالح الفراء نے یہ قول نقل کیا ہے کہ:۔ ابو حنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ نبی ﷺ مجھے پاتے اور میں آپ ﷺ کو پاتا (یعنی دونوں ہمعصر ہوتے) تو آپ ﷺ میرے اکثر اقوال کو اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے (بغدادی۔ جلد۔ ۱۳۔ صفحہ نمبر ۲۹۰)۔'' یہی بات صفحہ نمبر ۲۸۷ پر بھی محمود بن موسیٰ کے حوالے سے بیان کی گئی ہے۔ البتہ اس میں یہ بھی مزید کہا گیا ہے کہ:۔ ''اور ابو اسحاق کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابو حنیفہؒ کے سامنے اکثر نبی ﷺ کی حدیثیں آتیں اور وہ مخالفت کرتے۔'' اس سے آگے پھر، وہ خطیب بغدادی (صفحہ نمبر ۲۹۰) کا حوالہ دیتے ہیں جس میں ابو حنیفہؒ نے شہد کا چھتہ چرانے والے شخص کا ہاتھ کاٹ دینے کا فتویٰ دیا اور اس اعتراض پر کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ ''ابو حنیفہؒ نے پھر بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گزر چکا اور ختم ہو چکا ہے۔'' اس سے آگے پرویز صاحب تبصرہ کرتے ہیں:۔ ''امام صاحبؒ کے قول کا آخری ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ مجھے شک ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فیصلہ دیا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی ارشاد فرمایا ہوگا لیکن وہ فیصلہ اُس زمانے کے حالات کے مطابق تھا۔ اب حالات بدل چکے ہیں، اس لئے اب فیصلہ موجودہ حالات کے مطابق ہونا چاہیئے۔

علّامہ اقبالؒ کا تبصرہ:۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہی مسلک تھا جس پر علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں بڑا بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ پہلے شاہ ولی اللہؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ:۔ ''پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی

معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، لیکن ان اصولوں کا نفاذ اُس قوم کی عادات وخصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اُس وقت اُس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔'' (خطبات۔ تشکیلِ جدید۔ چھٹا خطبہ)۔ اس کے بعد علامہ اقبال لکھتے ہیں:۔ ''غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم، ابوحنیفہؒ نے جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے، اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی فقہ کا مدار حدیث پر کیوں نہیں رکھا۔'' اس کے بعد وہ (اقبالؒ) لکھتے ہیں۔ ''ان حالات کی روشنی میں، میں سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور آج اگر کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں، تو اُس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا، جن کا شمار فقہاء اسلامی کے بلند ترین مقنین میں ہوتا ہے۔'' (خطبات۔ صفحہ نمبر ۱۶۴۔ ۱۶۳)۔

فقہ غیر متبدل قرار پا گیا:۔ یہ تھا امام ابوحنیفہؒ کا مسلک جو عہدِ رسالتمآب ﷺ اور خلافتِ راشدہ میں رائج مسلک کے عین مطابق تھا۔ لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ایک تحریک ابھری جس کی رو سے یہ عقیدہ عام کیا گیا کہ جو کچھ پہلے زمانے میں ہو چکا ہے، اس میں سرمو تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ وہ عین دین ہے اور اس میں تغیر وتبدل الحاد و بے دینی۔ جو کچھ سوچا جانا تھا، سوچا جا چکا۔ جو کچھ سمجھا جانا تھا، سمجھا جا چکا۔ اب غور وفکر (کہ جسے اجتہاد کہتے ہیں) کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ شریعت کے جو احکام عہدِ رسالتمآب ﷺ میں نافذ ہو چکے تھے، وہ قیامت تک کے لئے غیر متبدل ہیں۔ ایک گروہ نے اس میں اتنا اضافہ کیا کہ ان میں وہ احکام بھی شامل ہیں جو خلافتِ راشدہ کے زمانے میں نافذ العمل تھے۔ چنانچہ ان احکام کے مجموعے مرتب کئے گئے اور وہ اُمت کے لئے دائماً، ناقابلِ تغیر وتبدل، ضابطہء قوانین قرار پا گئے۔'' اس کے بعد پرویز صاحب امام شافعیؒ کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے اس تحریک کو پُرجوش طریقے سے چلایا اور وحی متلو۔ غیر متلو، مثلہٗ معہٗ۔ وغیرہ جیسے عقائد پھیلائے، جس کے بعد ایسے عقائد وضع کئے گئے کہ ''حدیث قرآن پر قاضی ہے بلکہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔ تھوڑا سا آگے چل کر پرویز صاحب کہتے ہیں کہ:۔ ''ظاہر ہے کہ اس تحریک کا پہلا ہدف، امام ابوحنیفہؒ کو قرار پانا تھا جنہوں نے یہ مسلک پیش کیا تھا کہ وہ فیصلے، غیر متبدل احکامِ شریعت نہیں تھے۔ چنانچہ ان حضرات کی طرف سے امام صاحبؒ کے خلاف وہ کچھ کہا گیا جسے دہراتے ہوئے ہماری روح پر کپکپی چھا جاتی ہے۔'' پرویز صاحب نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو ''ابلیس کا فتنہ''۔ ''دجال کے فتنہ کے بعد بڑا فتنہ''۔ ''بدبخت''۔ ''بدترین''۔ ''نیا اسلام تصنیف کرنے والا'' کہا گیا اور یہ کچھ امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ جیسے لوگوں کی طرف سے کہا گیا۔

اجتہاد کے دروازے بند:۔ اس سے آگے پرویز صاحب رقمطراز ہیں:۔ ''امام اعظمؒ کے مسلک کے متبعین نے کچھ

وقت تک تو اس مخالفت کا مقابلہ کیا لیکن چونکہ مخالفین لوگوں کو یہ کہہ کر بھڑکاتے تھے کہ یہ لوگ منکرینِ حدیث ہیں اور منکرینِ شانِ رسالت ہیں، اس لئے انہیں اس سیلابِ بے پناہ کے سامنے سپر انداز ہونا پڑا۔ اور اس عقیدہ کو تسلیم کر لیا کہ جو احکام احادیث میں ہیں، وہ ناقابلِ تغیر ہیں اور پھر اپنی فقہ کے فیصلوں کی تائید، احادیث سے شروع کر دی۔ یوں خود فقہ حنفی کے فیصلے غیر متبدل قرار پا گئے۔ اور ان پر اجتہاد کے دروازے بند ہونے شروع ہو گئے۔ رفتہ رفتہ، یہ اس عقیدہ تک پہنچ گئے کہ (احادیث تو ایک طرف) جو کچھ ائمہ فقہ کہہ چکے ہیں وہ بھی قیامت تک ناقابلِ تغیر و تبدل ہے۔ (اس سلسلہ میں ''فقہ'' کے تحت، فقہ حنفی کے امام، الکرخی کا قول پیش کیا جا چکا ہے۔ مؤلف)۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں اجتہاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اجتہاد تو ایک طرف، یہ حضرات اب کسی مزید تحقیق و تفتیش کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔ (اس معاملہ میں جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے مفتی جمیل احمد تھانوی کی رائے ''ائمہ فقہاء'' کے ذیلی عنوان ''شرک'' کے تحت پیش کی جا چکی ہے۔ مؤلف)۔ حالانکہ ان کے سامنے خود امام اعظمؒ کا یہ مسلک موجود ہے کہ وہ اپنے فیصلوں کو بھی ناقابلِ تغیر و تبدل قرار نہیں دیتے تھے۔'' اس سلسلے میں پرویز صاحب نے امام زفرؒ کا حوالہ دیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اپنی رائے یا فیصلوں کو حتمی نہیں کہتے تھے (بحوالہ خطیب بغدادی۔ جلد ۱۴۔ صفحہ نمبر ۳۵۲)۔ اس سے آگے پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:۔ ''یہ تھا امام صاحبؒ کا مسلک خود اپنی فقہ کے متعلق۔ یہی وجہ ہے کہ جسے فقہ حنفی کہتے ہیں، اس میں امام صاحبؒ کی کوئی کتاب شامل نہیں۔ انہوں نے فقہ کی کوئی تصنیف اپنے پیچھے نہیں چھوڑی تھی۔''

عقل و فکر مفلوج ہو گئے:۔ پرویز صاحب آگے کہتے ہیں کہ:۔ ''جس فقہ کو خود اس فقہ کے بانی، امام ابوحنیفہؒ ناقابلِ تغیر قرار نہیں دیتے تھے، ان کے نام لیواؤں نے اسے قیامت تک کے لئے غیر متبدل قرار دے لیا۔ اور اس طرح اُمت پر اجتہاد کے تمام دروازے مستقلاً بند ہو گئے۔ یہ کیفیت صدیوں سے مسلسل چلی آ رہی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ عقل و فکر کی تمام صلاحیتیں، جنہیں قرآن کریم نے وجہِ شرفِ انسانیت قرار دیا ہے، پہلے شل اور پھر رفتہ رفتہ مفلوج ہو کر رہ گئیں۔''

تقلید کی شدّت:۔ پرویز صاحب اس کی وجہ ''تقلید'' کو قرار دیتے ہیں کہ:۔ ''اسلامی زندگی سے مقصود یہ قرار پایا کہ قدم بقدم اسلاف کے راستے پر چلا جائے۔ کسی نے اس سے سرمو انحراف یا تجاوز کیا اور اربابِ شریعت کی بارگاہوں سے کفر و الحاد کے فتووں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔'' ''یہ مسلک اور عقیدہ اس قوم کا ہے، جس کا خدا، کفار کے متعلق کہتا ہے کہ جب ان کے سامنے حقائق پیش کئے جائیں تو بجائے اس کے کہ یہ ان پر عقل و فکر کی روشنی میں غور کریں، اور دلائل و براہین کی رو سے ان کے متعلق بحث و تمحیص کریں، یہ اتنا کہہ کر ان حقائق سے انکار کر دیتے ہیں کہ: بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۴۳/۲۲)۔ ''ہم نے اپنے آباواجداد کو ایک راستے پر چلتے پایا اور ہم انہی کے نقوشِ قدم پر چلتے جائیں گے۔ اس لئے ہم کوئی ایسی بات سننا بھی نہیں چاہتے جو ہمیں اسلاف کے راستے سے دوسری طرف لے جانے کا موجب بنے۔'' دوسرے مقام پر ہے: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۲/۱۷۰)۔ جب ان سے کہا جاتا ہے

کہ تم قرآن کی پیروی کرو تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اس راستے پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے پایا ہے۔ اس پر قرآن کہتا ہے اَوَلَوْ کَانَ الشَّیْطٰنُ یَدْعُوْھُمْ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیْرِ (۳۱/۲۱)۔ ''خواہ شیطان انہیں جہنم کی دعوت ہی کیوں نہ دے، یہ اسی راستے پر چلتے جائیں گے۔''

تقلید اور قرآن:۔ اس کے جواب میں ہمارے اربابِ شریعت کہہ دیا کرتے ہیں کہ کفّار کے اسلاف چونکہ غلط راستے پر چلتے تھے اس لئے اُن کی تقلید ناجائز تھی۔ ہمارے اسلاف صحیح راستے پر چلتے تھے اس لئے اُن کی تقلید ناجائز نہیں قرار پا سکتی۔ ایسا کہتے وقت وہ اس علت پر غور نہیں کرتے جس کی بناء پر تقلیدِ اسلاف سے روکا گیا ہے وہ علت یہ ہے کہ خدا جب: ما انزل اللہ کے اتباع کا حکم دیتا ہے تو اس لئے کہ ما انزل اللہ کی راہنمائی غیر متبدل ہونے کی وجہ سے ہر زمانے میں واجب الاتباع ہوتی ہے، اور اسلاف کا مسلک، خواہ اُن کے زمانے میں صحیح بھی کیوں نہ ہو، ہر زمانے میں اتباع کے قابل نہیں ہوتا۔ اس لئے ابدی پیروی کتاب اللہ کی ہوگی نہ کہ کسی سابقہ زمانے کی روش کی۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی اس باب میں قندیلِ ہدایت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:۔ الناس اشبہ بزمانہم من اسلافھم۔ (جاحظ۔ البیان والتبیین)۔ ''لوگ اپنے اسلاف کے مقابلہ میں، اپنے زمانے سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔''

(تقلید شرک ہے اور اللہ کے قانون (قرآن کریم) کے علاوہ کسی دوسرے قانون یا شخصیت کی تقلید ناجائز ہے۔ مگر حیرت ہے کہ ہمارے فرقہ پرست حضرات خود کو فخریہ ''مقلّد'' یعنی ''مقلدینِ ائمہء فقہ'' کہتے اور باقی حضرات کو ''غیر مقلد'' کہہ کر انہیں اپنے طور پر گمراہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ قرآنی حقیقت یہ ہے کہ جونہی کوئی شخص خود کو شیعہ، سنی (بریلوی، دیوبندی)، اہل حدیث، مالکی، شافعی وغیرہ کہتا ہے وہ اسی وقت شرک، ارتداد اور کفر کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ قرآن نے ہمارا نام صرف ''مسلم'' رکھا ہے۔ مؤلف)

جمود کی دوسری وجہ:۔ ''دین میں اس قدر جمود و تقلید کی بنیادی وجہ یہ بھی ہوئی کہ ہماری حکومتیں اسلامی نہ رہیں۔ اس سے زندگی میں ثنویت (Dualism) پیدا ہو گئی۔ دنیاوی امور حکومت نے اپنے ذمے لے لئے اور شرعی امور (جن سے مراد شخصی قوانین تھے) اربابِ شریعت کے حیطہء اقتدار میں چلے گئے۔ سلطنتیں، اپنے دائرہء اختیار میں، قوانین میں ردوبدل کرتی رہیں لیکن اربابِ شریعت نے اسی میں عافیت دیکھی کہ جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے وہ اسی کی پابندی کرتے رہیں۔ اس کے لئے عقیدہ یہ وضع کر لیا گیا کہ ہر آنے والا زمانہ، سابقہ زمانے کے مقابلہ میں، برّ و تقویٰ ہی میں نہیں، علم و بصیرت میں بھی پست تر اور خراب تر ہوتا ہے۔'' تھوڑا سا آگے چل کر لکھتے ہیں:۔ ''یہ ذہنیت اگر انفرادی جذبات کی حد تک رہتی تو پھر بھی اس میں چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن اس نے اصولِ دین کی شکل اختیار کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُمت کو اپنا ماضی روشن دکھائی دیا، حال تاریک اور مستقبل تاریک تر۔

(جاری ہے)

ڈاکٹر اعجاز رسول
erasool@aol.com

قرآن اور انسانی عقل

انسان ایک عظیم مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ مقصد سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس بات کو سمجھا جائے کہ انسان کن اشیاء کا مرکب ہے۔ انسان کے پاس بنیادی طور پر درج ذیل قوانین ہیں۔

1۔ انسان کا احساس شعور (Sense of Identity): یہ انسان کی زندگی کے دوران تبدیل نہیں ہوتا۔

2۔ انسانی جذبات: ان کی تعداد ایک اندازے کے مطابق تین ہزار سے اُوپر ہے۔ اس سے اوپر ہر جذبہ (Emotion) کا پیمانہ ہے۔ مثلاً ہم ناراض ہوتے ہیں تو یہ ناراضی تھوڑی سے لیکر بہت زیادہ ہوسکتی ہے۔ اس طرح ہمیں غصہ آتا ہے تو یہ بھی تھوڑی مقدار سے بہت بہت زیادہ ہوسکتا ہے۔ یعنی ہر جذبہ کا Scale ہے۔

3۔ ہم سوچتے ہیں: سادہ سوچ وہ ہے جس میں ہم زیادہ زور نہیں دیتے۔ جیسے ہم کسی کو ملتے ہیں اور علیک سلیک ہوتی ہے۔ عام لیول کی گفتگو ہوتی ہے۔

4۔ ہم سوچ کے متعلق سوچ سکتے ہیں: اسے عام طور پر Meta Cognition کہتے ہیں۔ یہ قابلیت ہمیں قوت فیصلہ دیتی ہے۔ اس قابلیت کی وجہ سے ہمارے اندر ہدایت نہیں رکھی جاسکی کیونکہ Free will اور Internal Guidance ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ یہ ایک عظیم قابلیت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ ہمیں لاانتہا قوتوں کا مالک بنایا ہے اور اس کا استعمال اگر قرآنی فکر کے اندر رہ کر کیا جائے تو زندگی ایک نئی زندگی بن جاتی ہے۔ اس پر ہم بعد میں تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

5۔ ہماری یادداشت: یہ قابلیت انسانی سوچوں کے ساتھ بے پناہ قوتوں کی مالک ہے۔ ہم اپنی یادداشت میں اپنی کوشش سے علم کا اضافہ کرسکتے ہیں۔ ہم دوسروں کے کام سے سیکھ سکتے ہیں۔ بنیادی لیول سے یعنی نام یاد رکھنے سے لیکر انتہائی مشکل Mathematical concepts کو ہم یاد کرسکتے ہیں۔ اس سے ہم قرآنی فکر کو اپنے ذہن میں یاد کرکے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

6۔ انسانی جسم: اس میں اپنی ہیئت اور ڈیزائن کی وجہ سے بہت قوت رکھی گئی ہے۔ اس انسانی جسم کی بدولت ہم نے سائنس کے میدان میں علم حاصل کرکے قدرتی وسائل پر قابو پاکر بے شمار فائدے حاصل کرلیے ہیں۔ انسانی جسم کا علم ہم سائنس کی روشنی میں حاصل کررہے ہیں۔ اس کے اندر بھی بے شمار قوتیں کام کررہی ہوتی ہیں۔ لیکن اس کی سب سے بڑی کمزوری اس کی بنیادی ضروریاتِ

زندگی ہیں اور اس کی موت ہے۔ ان دو باتوں کا سمجھنا بہت ضروری ہے اگر ہم انسانی زندگی کی اہمیت سمجھنا چاہتے ہیں۔ اسی انسانی جسم کے استعمال سے ہم مزید ارتقائی منزلیں طے کر سکتے ہیں۔ لیکن انسانی جسم کی ضروریاتِ زندگی صرف پورا کرنا ہماری عقل کا مقصد نہیں ہونا چاہیے۔

7۔ دوسرے انسان: انسانی زندگی اکیلے نہیں گزر سکتی ہے۔ اسے دوسرے انسانوں کی ضرورت ہے۔ انسان کے اندر ایسے جذبات ہیں جو کہ اسے دوسرے انسانوں سے تعلقات پر مائل کرتے ہیں۔ اگرچہ انسان اپنی قوت فیصلہ سے یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ کس کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کرنا چاہتا ہے۔

8۔ زمین: انسانی زندگی کے لیے زمین کے وسائل بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ جدید سائنس کی روشنی میں ہمیں علم ہے کہ زمین ہی وہ Planet ہے جس پر زندگی ممکن ہے۔ انسان ان وسائل سے اپنے اور دوسرے انسانوں کے فائدہ کے لیے کام کر سکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں انسان نے زمین کا ایک ایک کونا چھان مارا ہے اور مزید تحقیقات ہو رہی ہیں تاکہ زمین کے وسائل سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ زمین کو انسان نے مختلف ملکوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور باہمی مقابلے سے بے شمار نئے نئے طریقے ایجاد ہو رہے ہیں تاکہ ایک دوسرے سے سبقت لی جا سکے۔

9۔ کائنات: زمین سے آگے کائنات ہے۔ جس کا علم انسان نے کچھ حد تک حاصل کیا ہے اور مزید حاصل کرنے کی کوشش جاری ہے۔ انسانی سوچ کی چونکہ کوئی متعین حد نہیں ہے اس لیے انسان جب تک زندہ رہتا ہے اپنی زندگی اور اردگرد کی کائنات کے متعلق سوچتا رہتا ہے۔

10۔ قرآنی فکر: انسان اپنی سوچوں کا استعمال کر کے اپنی زندگی کے دوران بے شمار سوالات کا جواب ڈھونڈتا رہتا ہے۔ اِن سوالات کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان نے اتنی ترقی کر لی ہے اور دوسرے Planets اور Stars کے متعلق علم حاصل کر لیا ہے۔ اگرچہ انسان اپنی جسمانی کمزوری (Physical limitation) اور وسائل نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے Planets پر نہیں جا سکتا لیکن اپنی عقل اور دماغی قوت کی وجہ سے وہ اپنی زندگی کو اس کائنات کے ساتھ Relate کر سکتا ہے۔ پھر Telescopes وغیرہ کی وجہ سے وہ اس قابل ہو گیا ہے کہ اس اردگرد کی کائنات کے متعلق علم حاصل کر سکے۔ لیکن پھر بھی کچھ ایسے سوالات ہیں جن کا علم انسان کے پاس نہیں ہے مثلاً

(ا)۔ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔

(ب)۔ یہ کائنات کیسے وجود میں آئی۔

(ج)۔ اس کائنات کا اختتام کیسے ہوتا ہے۔ اگرچہ عام انسانی زندگی تقریباً 80-102 سال ہے لیکن اس کی فکر لاکھوں سالوں

کی رہتی ہے۔

(د)۔اس کائنات کو کس نے بنایا ہے اور اگر کسی نے بنایا ہے تو اس کو ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

(ر)۔زندگی ختم کیوں ہو جاتی ہے۔خاص کر جو انسان صاحب قوت اور امیر ہیں اُن کا دل نہیں چاہتا کہ اُن کو موت آئے۔

(ز)۔کیا موت کے بعد بھی زندگی ہے۔اگر زندگی ہے تو اُس کی کیا شکل ہوگی اور کیا ہم اُس کو اپنی موجودہ سطح پر سمجھ سکتے ہیں۔ اگر سمجھ نہیں سکتے تو اُس سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

(س) کیا God ہے تو کون سا نظریۂ ایسا ہے جس سے انسان ذاتی طور پر فائدہ اٹھا سکے۔

اس طرح کے اور سوال ہیں جو کہ انسان کے دماغ میں آتے ہیں اور وہ ان کی تلاش میں لگا رہتا ہے۔اور اپنا وقت پورا کر کے موت سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔اس کو ہم ایک Equation کی صورت میں بھی لکھ دیتے ہیں۔

Human Life = Sense of Identity + Emotions + Thinking + Metacognition

+ (Human Memory) + (Human Body + other Human Beings)

+ (Earth + Universe) + the Quran (optional)

یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ انسانی زندگی میں انسان ہی مسائل پیدا کرتے ہیں اور انسان ہی مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں۔چونکہ انسان مل جل کر رہتے ہیں۔اس لئے آئین واقدار کی ضرورت ہوتی ہے۔بنیادی طور پر انسان اپنی خوشی کو بڑھانا چاہتا اور اپنی مشکلات کو آسان کرنا چاہتا ہے۔چونکہ انسانی جسمانی زندگی کا انحصار زمینی وسائل پر ہے اس لئے جو انسان زیادہ طاقتور ہے وہ زیادہ وسائل پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے انسان بنیادی ضروریات زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں یہ طاقتور انسان انسانوں کے ہی ذریعہ دوسروں پر قابو رکھتے ہیں۔انہی وجوہات کی بنا پر ہماری موجودہ زندگی میں مختلف قوموں نے جنم لیا ہے۔ہر قوم کے اوپر ایک حکمران طبقہ ہے جو کہ دوسرے اپنے جیسے انسانوں کو اپنے کنٹرول میں رکھتا ہے۔اس کے لیے نظام کوئی بھی ہو (سوائے قرآنی نظام کے) عام انسانوں کا تعلق حکمران طبقہ کے ساتھ حاکم اور محکوم کا ہوتا ہے۔لیکن ان سب کی زندگی کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے کہ انسانی جسم کی ضروریات زندگی کو پورا کیا جائے اور اپنے لئے زیادہ سے زیادہ اکٹھا کر لیا جائے یعنی سرمایہ دار نظام۔

ابھی ہم قرآنی فکر اور انسانی عقل کے باہمی تعلق کی طرف چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ انسانی عقل اس سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

انسان جتنا بھی اس سوال کا جواب نہ چاہے یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کائنات اور انسان کی پیدائش کے پیچھے کوئی قوت کارفرما ہے جو کہ ایک قائدہ اور قانون کے مطابق کام کرتی ہے۔اس قوت کے چند ایک اصول ہیں جو کہ مشاہدہ سے ہم سب کے علم میں ہیں۔

(1) کائنات جس کا ہم روز مشاہدہ کرتے ہیں۔ایک قانون کے تحت کام کر رہی ہے مثلاً Gravity اور Rotation۔

(2) انسانی زندگی کے مقابلہ میں اس کائنات کی عمر (Age) کہیں زیادہ ہے۔اس سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ جسمانی عمر کے لیول

پر ہماری اہمیت بہت کم ہے۔

(3) اگر ہم سوچیں تو یہ ساری کائنات بے مقصد ہے اگر ہم اور آپ اس کے متعلق نہ سوچ سکیں یہ ہماری سوچیں ہیں جو کہ اس کائنات کو کوئی Meaning دیتی ہیں اور اس سے کائنات ہمیں Meaning دیتی ہے۔

(4) اوپر سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اگر ہم صرف جسم ہوں تو ہماری کائنات بے مقصد ہے۔ لیکن اگر میرے اندر ایک ذات ہے۔ یعنی میرے خیالات اور سوچیں تو یہ کائنات ایک ایسی حیثیت کے طور پر اُبھرتی ہے کہ جس سے یہ میری زندگی کو ایک مقصد عطا کرتی ہے۔ میں اس کائنات کے لیے نہیں ہوں۔ بلکہ یہ کائنات میرے لیے ہے۔ میں اس کو ایک Opportunity کے طور پر استعمال کر کے اس کی حدوں سے آگے جا سکتا ہوں۔

(5) یہ کائنات اور ہم ایک حقیقت ہیں جس کا مشاہدہ ہم روز کرتے ہیں۔ لیکن یہ قوتِ مشاہدہ بذات خود ایک حقیقت ہے جس کو ہم اپنے ذہن کے لیول پر سمجھتے ہیں۔ ہمیں اپنی ذات کا احساس ہر وقت رہتا ہے (غالباً نیند کی حالت میں یہ احساس غالب آجاتا ہے)۔ ہمیں اپنی ذات اور اپنے وجود کا احساس رہتا ہے اور ہمیں علم ہوتا ہے کہ ہم زندہ ہیں اور اپنی پسند اور ناپسند وغیرہ کے احساس سے ہمیں اپنی Personality ابھی علم رہتا ہے۔ یہ انسانی وجود ہمارے جسمانی وجود سے علیحدہ چیز ہے جو کہ اگرچہ نظر نہیں آتی لیکن اس کا احساس ہمیں اس کے وجود کے متعلق علم پہنچاتا ہے۔

(6) یہاں سے ہم ایک Step آگے چلتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی میں کئی کام کرتے ہیں مثلاً کھانا، لکھنا، گاڑی چلانا وغیرہ۔ یہ سب کام ہمارے ذہن کی پیداوار ہیں۔ ہم کوئی کام نہیں کر سکتے اگر ہم اُس کے متعلق پہلے سے سوچتے نہیں ہیں۔ انسانی کاموں کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اتنی بڑی کائنات کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہوگا؟ اس مقصد کا پتہ چلانا ہمارا کام ہے۔ اس لیے کہ اگر میری زندگی کا کوئی مقصد ہے۔ تو اُس مقصد کو ڈھونڈنا بھی میرا مقصد ہونا چاہئے۔

(7) ہمارا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ ہم نے جو بھی قابلیت حاصل کی ہو مثلاً اعلیٰ تعلیم، اعلیٰ ہنر، تجربہ وغیرہ ہم اپنے بچوں کو بذریعہ پیدائش نہیں دے سکتے۔ ہر بچے کو جسمانی طور پر ہماری شکل اور کچھ Genes وغیرہ تو مل جاتے ہیں لیکن Acquired Abilities نہیں مل سکتیں۔ یہ بھی قانون کا حصہ ہے۔

(8) اپنی زندگی گزارتے ہوئے ہم دوسروں کے ساتھ Interact کرتے ہیں۔ اس کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے اور دوسروں کا اثر ہم پر پڑتا ہے۔ ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ دوسروں کے ساتھ ہمارے رویہ اور الفاظ کا اثر بعض اوقات نتیجہ کافی دیر بعد پیدا کرتا ہے۔ مثلاً اگر کسی نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے تو میں اُس کو اُس وقت شاید کسی وجہ سے برداشت کروں لیکن بعد میں اگر احساس قائم رہے تو میں اس کا بدلہ لے سکتا ہوں۔ اسی طرح بعض اوقات دوسروں کے اعمال کا دوہرا اثر ہوتا ہے مثلاً کسی نے اگر ہمیں دھکا دیا ہے تو اُس کے نتیجہ میں جسم کو بھی تکلیف ہوگی اور ساتھ ہی ذہنی اذیت بھی ہوگی۔

(9) ہمیں وقت کا احساس رہتا ہے۔ دن اور رات کے گزرنے کا احساس اور اپنی عمر کے گزرنے کا احساس ہمیں کام جلدی کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ساتھ ہی انسانی ضروریات کے لیے ہمیں زندگی میں کوشش کرنی پڑتی ہے۔

(10) ہم کس جگہ پیدا ہوئے ہیں اور کس گھر میں پیدا ہوئے ہیں۔ یہ ہمارے کنٹرول میں نہیں ہے۔ بچہ کو پیدائش کے وقت کسی چیز کا علم نہیں ہوتا کہ اُس کا رنگ، ذات، ماں باپ، مذہب، شکل، Gender وغیرہ کیا ہوں گی وہ صرف ان باتوں کا احساس کچھ سالوں بعد کرتا ہے۔ پیدائش کے وقت دوسرے بچوں کے برابر ہوتا ہے اور صرف اپنی ذات لیکر آتا ہے۔ باقی سب چیزیں اضافی ہوتی ہیں۔

ابھی ہم قرآن کی طرف آتے ہیں اور مختصراً دیکھتے ہیں کہ یہ ہمیں کیا دیتا ہے۔

(1) قرآن انسانی زندگی کا مقصد انسانی اعمال کے نتیجہ کو ظاہر کرنا بتاتا ہے اور قانونِ مکافاتِ عمل کو تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ (45:22) اس آیت میں کائنات کا مقصد بتایا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ چونکہ اعمال کا اثر ہماری ذات پر ہوتا ہے اس لئے ناانصافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(2) قرآن انسانی سوچ کی پیداوار نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ انسانی سوچ کے متعلق ہمیں حقیقت سے روشناس کرواتا ہے اور چونکہ ہم انسان قرآن کی طرح سوچ نہیں سکتے اس لیے قرآن ہمیں کہتا ہے کہ کوئی انسان ایسا سوچ کر لکھ نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی انسان قرآن کا متبادل نہیں بنا سکتا اور نہ ہی کوئی قرآنی آیت بنا سکتا ہے۔

(3) چونکہ انسان قرآن کی طرح سوچ نہیں سکتا اور انسان کے اندر کوئی راہنمائی نہیں رکھی گئی اس لیے انسان کو قرآن بحیثیت رہنمائی کے اپنی سروس ایک Option کے طور پر آفر کرتا ہے۔ یہ انسان کی Free will کا استعمال ہے کہ وہ اس کی فکر کو استعمال کر کے اس آفر کو قبول کرے یا انکار کر دے۔

(4) قرآن کو ایک وحی کے طور پر قبول کرنے کے لیے عقل اور فکر کے استعمال کی اشد ضرورت ہے کیونکہ قرآنی فکر ہے ہی انسان کے ذہن کی رہنمائی کے لیے تاکہ انسانی فکر جن سوالات کے جوابات ڈھونڈتی ہے۔ قرآن اُن کے جوابات مہیا کرتا ہے ان جوابات کو پھر ہم اپنی زندگی کے تجربات اور Evidence پر پرکھ کر ان پر ایمان لاتے ہیں۔

(5) انسان کا ذہن چونکہ جذبات، خیالات اور یاداشت کا مرکب ہے۔ اس لیے انسان اپنی زندگی کے دوران مختلف شخصیات (Personality) سے گزرتا ہے۔ یہاں تک کہ Multi self تھیوری کے مطابق انسان کی شخصیت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ قرآن اس کا آسان حل پیش کرتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ اپنی عقل اور فکر کو استعمال کر کے اپنے Self کے لیول پر اللہ کو اپنا ماڈل بنالو اور اپنی یادداشت میں اس کو محفوظ کرلو۔ اس کے ساتھ مستقل اقدار کو سمجھ کر اپنی یاداشت میں محفوظ کرلو اس طرح ایک Integrated self وجود میں آجائے گا۔ ابھی جو بھی کام کرو گے اُس میں اپنے ذہن میں جو بھی مستقل قدر کی ضرورت ہے۔ اُس کو استعمال کرلو۔ نتیجہ

وہ ملے گا جو قرآن کے اندر دیا ہوا ہے۔

(6) قرآن نے دوسروں کی مدد کا بار بار ذکر کیا ہے۔ ہر انسان کے Self کے آگے بڑھنے کے لیے ایک اہم ضرورت ہے۔ اس میں ایک بہت اہم بات ہے کہ وہ انسان کو انسانیت کے لیول پر سوچنے کا بار بار کہتا ہے۔ یہ اس لئے کہ انسان بغیر قرآن کے جغرافیائی حدود میں مقید ہو جاتا ہے۔ قرآن چونکہ انسانی ذہن کو تبدیل کرتا ہے تاکہ وہ پوری کائنات کے متعلق سوچنا شروع کر دے اس لیے وہ انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ پوری انسانیت کے مسائل پر غور کرے اور ایسا وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے ہی شروع کر سکتا ہے۔

(7) قرآن کی وحی ایک Seed کی طرح ہے۔ یہ ذہن انسانی کو تدریجاً Influence کرتی ہے اور انسان اپنی فکر کے ساتھ اس کو اپنے ذہن میں درجہ بدرجہ Grow کرتا ہے۔ اس سے انسان انفرادی مسائل کے حل سے انسانیت کے مسائل کے حل کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ممکن اسی وقت ہے کہ انسان کا ارادہ بھی انسانیت کے مسائل کا حل ڈھونڈنا ہو۔

(8) قرآن کے مطابق (اور ہمارے فکری مشاہدہ کی رُو سے بھی) اس دنیا اور اگلی دنیا کا اللہ ایک ہی ہے۔ اس لیے Self کے لیول پر یہاں سے دوسری دنیا تک کا سفر ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔ اس لیے قرآن نے موت کو چکھنے سے تشبیہ دی ہے یعنی Self کے لیول پر انسان موت کا صرف ذائقہ چکھے گا (29:57)۔

(9) قرآن کا علم ہمیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ ہم انسانی دُنیا اور قانونِ مکافاتِ عمل کو اللہ تعالیٰ کی نگاہ سے دیکھنے کے قائل ہو جائیں (انسان کی حد تک)۔ اس سے ہمیں اپنی قوتِ عمل کا اندازہ ہو جاتا ہے اور ذہنی طور پر اور عملی طور پر اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس حد تک انسان اپنے اعمال کی دنیا میں آزاد ہے۔

(10) قرآن انسانی زندگی کے مسائل کی بہترین Explanation مہیا کرتا ہے جو کہ انسانی ذہن کی تسلی کر دیتا ہے۔ یہ عقل کے معیار پر پورا اُترتا ہے اور کوئی ابہام نہیں چھوڑتا۔ لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ انسان کھلے دماغ سے اس کی طرف آئے اور اس کے پیش کردہ حل کو غیر متعصب (Unbiased) ہو کر غور کر لے۔ مثلاً قرآن نے ایک بہترین Economic System دیا ہے جو کہ ہر انسان کے بنائے نظام حیات کے خلاف ہے اور دونوں انسانی حصوں کی تکمیل کرتا ہے یعنی انسانی جسم اور انسانی ذات۔

(11) ظاہری طور پر ایسا لگتا ہے کہ اگر انسان قرآن کی ہدایت کی طرف آیا تو شاید اُس کی قوتِ رائے کم ہو جائے گی یعنی اُس کی Free will محدود ہو جائے گی لیکن دراصل قرآنی فکر سے انسان کی Free will کا دائرہ لامحدود ہو جاتا ہے کیونکہ یہ فکر انسان کو عقل کی سطح پر پوری دنیا کو دیکھنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ ہر مرحلہ پر انسان کسی بھی مسئلہ کا حل Global لیول پر سوچتا ہے۔ پھر انسان خود کو پوری انسانی برادری کا فرد سمجھنے لگتا ہے چونکہ اس سوچ میں اگلی دنیا بھی آجاتی ہے۔ اس لئے انسان میں ''احساسِ آخرت'' پوری طرح بیدار ہو جاتا ہے۔ اس سے انسانی ذہن کی وسعتیں بڑھ جاتی ہیں اگر اس مقالہ کے سلسلہ میں کوئی سوال یا وضاحت درکار ہو تو آپ مجھے میری Email کے ذریعہ رابطہ کر سکتے ہیں۔

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com
www.azharabbas.com

روح انسانی کا عقیدہ قرآن کے خلاف ہے

حضور کے قائم کردہ انسانیت ساز نظام کا مطمع نگاہ ایک ایسا معاشرہ تھا کہ جس میں نہ تو کسی قسم کا خوف وحزن باقی رہتا ہے (2/38) اور جسم میں ہر فرد معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ (2/128) قرآن کریم کی انفرادیت اور اس کا بے مثال ہونا ہی یہ ہے کہ اس نظام میں جسم کے تمام طبعی تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں اور نفس انسانی کی بھی پوری پوری نشوونما ہوجاتی ہے۔ (3/164) انسانی ذہن کا وضع کردہ کوئی نظام بھی یہ دونوں تقاضے بیک وقت پورے نہیں کرسکتا۔ اگرچہ یہ نظام ایک شعلہ مستعجلہ کی طرح بہت مختصر عرصہ تک قائم رہا لیکن یہ اتنا طاقتور نظام تھا کہ اس کے اثرات نے کئی صدیوں تک مسلمانوں کو سنبھالے رکھا اور یہ اپنے Momentum پر چلتا رہا۔ اس کے اثرات منقرض ہونے کے بعد مسلمانوں کا زوال شروع ہوتا ہے اور تاتاریوں نے ساری امت کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اور اس زوال، سراسیمگی، خوف ودہشت کی وجہ سے مسلمانوں میں روحانیت اور پرستش میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پرستش کی بنیاد اساس روحانیت پر قائم ہوتی ہے اور یہ روحانیت اور پرستش کا عمل کسی بھی قوم کو تباہ وبرباد کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اسی عقیدہ اور عمل نے مسلمانوں کو بھی زوال پذیر ہونے کے باوجود مسلمانوں کو اپنے زوال کے احساس سے بے خبر رکھا۔ آپ ہزار بارہ سو سال کا سلامی لٹریچر ملاحظہ فرمائیں آپ دیکھیں گے کہ مفکر کو زوال کا احساس تک نہیں ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم کی جو آیات مسلمانوں کے غلبہ وتسلط یا اقامتِ دین اور اس کی فوقیت سے متعلق تھیں ان سب آیات کو ہمارے مفسرین نے اس طرح واضح کیا کہ یہ غلبہ قیامت یا روز محشر میں حاصل ہوگا اور اس کا اس موجودہ دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ 48/25, 9/33,4/41 اور یہ مفکرین ومفسرین خود بھی غلط فہمی میں مبتلا رہے اور پوری امت کو بھی غلط فہمی میں مبتلا کرکے لوریاں دے کر سلاتے رہے۔ ہمارے برصغیر ہندوپاک میں بڑے بڑے مفکرین ہوئے۔ ان مفکرین نے ہزاروں کتب تصنیف کی لیکن کسی نے بھی مسلمانوں کے زوال کے متعلق نہ تو کچھ تحریر کیا اور نہ اس کے تدارک کا کوئی حل پیش کیا۔ ہمارے برصغیر میں جناب شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کا خانوادہ بڑی شہرت کا حامل ہے۔ لیکن ان کی تحریروں میں بھی اس موضوع پر کوئی بحث نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کا عرصہ حیات 1703ء تا 1763ء تک ہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے دس بادشاہ دیکھے ہیں جس

سے ملک کی افراتفری کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے۔ پلاسی کی جنگ 1757ء میں ہوئی تھی جس کے بعد انگریزوں کو عملی طور پر ہندوستان پر پورا غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ لیکن شاہ ولی اللہؒ کی کسی کتاب میں انگریزوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس دور کے کسی مفکر نے انگریزی زبان نہیں سیکھی اور نہ ہی کوئی شخص انگلستان گیا کہ یہ تسلیم کرلے کہ یہ کون لوگ ہیں۔ یہ کہاں سے آئے ہیں۔ ان کی قوت اور طاقت کے کیا اسباب ہیں۔

ہمارے برصغیر میں سرسید احمد خاں پہلے بزرگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کے زوال کا پورا پورا احساس کیا اور انہوں نے اپنی تمام زندگی مسلمانوں کے زوال کو دور کرنے میں لگا دی اور ایک بڑی حد تک ان کی کوشش بار آور بھی ہوئی ہمارے علماء کرام کو بھی زوال کا احساس ہوا۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی اخلاص کا پیکر اور اسلام اور مسلمانوں پر جان دینے والے بزرگ تھے۔ انہیں انگریزی عدالتوں میں مترجم کی اسامی کی پیشکش ہوئی جہاں ان کی تنخواہ چالیس روپے ماہانہ تھی لیکن انہوں نے وہ قبول نہیں کی اور ساری عمر مکتبہ مجتبائی میں عربی کتابوں کی پُروف ریڈنگ میں گذار دی جہاں ان کی تنخواہ 15 روپے تھے اور مدرسہ دیوبند قائم فرمایا چونکہ ان کی تعلیم روایتی تھی اس لیے انہوں نے ''رُومانیت'' کے عمل کو جاری رکھا۔ اور اپنے زمانہ کے تقاضوں کو سمجھنے سے قاصر رہے اور ''دین'' کا کوئی تصور ان کے سامنے نہیں آسکا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ بعد اُمت مسلمہ میں ایک اور روشن ستارہ مولوی محمد عبداللہ صاحب کی شکل میں نمودآرا ہوکر چمکا۔ انہوں نے بہت محنت اور عرق ریزی سے اپنی کتاب ''ترجمۃ القرآن بآیات الفرقان'' تحریر کی۔ اس بلند پایہ کتاب نے قرآن فہمی کا فرسودہ طریقہ ہی بالکل بدل دیا۔ انہوں نے شان نزول اور روایات کو قرآن فہمی کا ذریعہ نہیں بنایا۔ کیونکہ ان دونوں چیزوں سے خارج از قرآن نظریات تفسیر قرآن میں داخل ہوجاتے ہیں۔ مولوی محمد عبداللہ نے قرآن کو قرآن سے سمجھنے کا طریقہ رائج کیا **القرآن یفسر بعضھا**۔ قرآن کا بعض حصہ، دوسرے بعض حصہ کی تفسیر کرتا ہے اس طریقے سے قرآن کی تفسیر کرنے میں خارج از قرآن کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہتی اور خالص قرآنی نظریات کے سامنے آجاتے ہیں۔ مولوی محمد عبداللہ صاحب کی خدمتِ قرآن کی دوسری شق ان کا ''روحانیت'' کی تردید کرنا ہے جو کہ بڑی ہمت کی بات ہے۔ لیکن مولوی محمد عبداللہ صاحب نے بڑی بہادری سے، علمی طور پر ان نظریات کی تردید کی اور اپنی اس بلند پایہ کتاب میں روحانیت کے خلاف بڑی طویل وعریض بحث کی ہے لیکن پھر بدقسمتی سے مولوی محمد عبداللہ صاحب کے سامنے بھی دین کا کوئی تصور نہیں تھا۔ روحانیت کی تردید کا لازمی ومنطقی نتیجہ مذہب کی تردید اور دین کے تصور کا سامنے آنا ہے لیکن افسوس کے مولوی محمد عبداللہ صاحب کی بالغ نگاہ یہاں تک نہیں پہنچ سکی اور اس کا سہرا علامہ اقبال کے سر بندھا کہ خلافت راشدہ کے بعد سے اقبال وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے دین اور مذہب کے

فرق کو Detect کیا۔ اقبال کا یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اقبال کے Six Lectures بہت مشہور ہیں۔ ان میں ایک لیکچر کا اضافہ بعد میں ہوا اور اب یہ سات خطبات ہیں۔ انگریزی زبان میں علامہ کی صرف یہ ایک کتاب ہے اور اس ایک کتاب نے مغرب سے اقبال کا لوہا منوایا ہے۔ یہ لیکچرز فلسفہ سے متعلق ہیں۔ ان سے صرف وہ لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو فلسفہ کے ماہر ہیں۔ ان لیکچرز کی زبان بہت Terse ہے اور ایک ایک فقرے میں کئی کئی فقروں کے مفاہیم آ گئے ہیں۔ پھر نہایت اختصار سے کسی مکتب فکر کو بیان کرتے ہیں، چند فقروں میں اس کی تردید کرتے ہیں اور اس پر قرآن کریم کا محاکمہ پیش کرتے ہیں۔ یہ کتاب عوام الناس کے مطلب کی نہیں ہے البتہ اس کا ایک خطبہ The Principle of movement in the structure of Islam ہے۔ اس کا نام تو بہت وحشت انگیز ہے لیکن اس کا مطلب ''اسلام میں قانون سازی کا اصول'' ہے۔ علامہ اقبال کا یہ ایک خطبہ سونے کے حروف سے لکھنے کے قابل ہے اور ہمارے اسلامی لٹریچر میں ایسا مضمون بہت مشکل سے فراہم ہوگا۔ اس میں علامہ نے دین اور مذہب کے فرق کو نمایاں کیا ہے۔ اگر کسی نے علامہ کا یہ مضمون نہیں پڑھا تو وہ علامہ کے اشعار کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا۔

ہمارا موجودہ دور قرآنی تناظر میں بڑا خوش بخت دور ہے کہ اس دور میں تحریک طلوع اسلام شروع ہوئی۔ اس تحریک نے روحانیت کی بھی تردید کی بلکہ اس کے بجائے قرآنی اصطلاح ''نفس'' کے تصور کو خوب واضح کیا۔ مذہب اور پرستش کو رد کر کے اقامت دین اور اطاعت الٰہی کو اپنی اساس بنایا۔ یہ تحریک خالص دین کی داعی ہے۔ انبیاء کرامؑ ہمیشہ دین کے داعی ہوتے تھے (42/13) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور مبارک میں دین قائم فرمایا اور حضورؐ کی سب سے بڑی سنت اقامت دین ہی ہے۔ خلافت راشدہ کا نظام بھی دینی نظام تھا۔ امت مسلمہ چونکہ وارثِ کتاب ہے (35/32) اس لیے امت کا فرض ہے کہ وہ اس کا نظام قائم رکھے۔ تیرہ صدیوں سے علماء اسلام کا اس بات پر اجماع ہے کہ اقامتِ دین فرض ہے اور جو شخص اقامت دین کی فرضیت سے انکار کرتا ہے وہ کفر کرتا ہے۔ غیر اسلامی نظام میں زندگی گذارنا جرم ہے۔ (6/123) اور جو شخص غیر اسلامی نظام میں زندگی گذارتا ہے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے (4/98) قرآن کریم نے صحابی کا لفظ کسی جگہ استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ اس میں Physical Presence ضروری ہے۔ قرآن کریم نے مَعَہٗ لفظ استعمال کیا ہے۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ (48/29) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے قیامت تک وہ حضرات جو حضورؐ کا دین قائم کریں گے اور ہجرت کریں گے وہ مَعَہٗ میں شامل ہیں سورۃ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ

رَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (9/100)۔

ترجمہ: اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے، اور جو ان کے پیروکار ہوئے نیکی کے ساتھ، اللہ ان سے راضی ہوا اور جو اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ ''تابع باحسان'' میں قیامت تک کے وہ لوگ شامل ہیں جنہوں نے اقامتِ دین کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں ہجرت کی۔ تفسیر معارف القرآن میں تحریر ہے ''قیامت تک آنے والے وہ سب مسلمان شامل ہیں جو ایمان اور عمل صالح میں صحابہ کرامؓ عملی اتباع کریں۔'' تفسیر نمونہ میں تحریر ہے ''وہ تمام افراد جو کسی نہ کسی طرح ان دونوں پروگراموں (ہجرت اور نصرتِ دین) پر عمل پیرا ہوں'' ''تابعین باحسان'' کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اس دور میں اقامت دین کی یہ اہمیت ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک اسلامی نظام کی اطاعت ہی عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔ اگر اسلامی نظام قائم نہیں ہوتا تو اللہ و رسول کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔ اس موجودہ دور میں ساری دنیا میں ایک میل زمین پر بھی اللہ و رسول کی اطاعت نہیں ہو رہی ہے۔ سب جگہ پرستش ہی پرستش ہے۔ اطاعۃ کی خصوصیت یہ ہے کہ طاعۃٌ معروفۃٌ اطاعت معروف ہوتی ہے اس کے نتائج اسی دنیا میں آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں جبکہ پرستش کے نتائج مرنے کے بعد Claim کئے جاتے ہیں۔ دین میں پرستش کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس میں مساجد الگ نہیں ہوتیں۔ اس مملکت کے سارے ادارے جہاں سے اسلامی احکامات جاری اور نافذ ہوتے ہیں وہ سب مساجد اللہ ہوتے ہیں۔ اسلامی مملکت کی پارلیمنٹ سپریم کورٹ، تحصیل، تھانے سب مساجد اللہ ہوتے ہیں۔

اصل موضوع کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ تحریک طلوع اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی تخلیق اور حیوانی تخلیق کا Process ایک ہی ہے۔ لیکن جب زندگی اس طریقہ کے مطابق مرحلہ بہ مرحلہ حیوانی سطح پر آجاتی ہے تو پھر قرآن کہتا ہے ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (23/14) (ترجمہ) پھر اُٹھا کھڑا کیا اس کو ایک نئی صورت میں تو پھر یہ زندگی انسانی پیکر میں آجاتی ہے اس فیز کو دوسرے مقام پر قرآن کریم نے نفخ روح کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس میں خدا نے اپنی روح پھونکی ونفع فیہ من روحہ (39/9)۔ اِس نفخِ روح کا نتیجہ ہے کہ انسان کو سماعت، بصارت اور علم حاصل کرنے کے ذرائع حاصل ہوگئے۔ اس جگہ قرآن کریم نے روح کو خود Define کردیا ہے۔ اس جگہ دو باتیں عرض کرنی ضروری ہیں۔ **روحہٖ** میں جو ترکیب ہے ہمارے مفسرین نے اس کو ترکیب اضافہ قرار دے کر اس کا ترجمہ اللہ کی روح کردیا ہے اور اس طرح روح کو اللہ کا جزو قرار دیا ہے۔ لیکن یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ کیونکہ اللہ کی ذات کا کوئی حصہ اس سے الگ نہیں ہوسکتا۔ اس کی ذات Divisible نہیں ہے۔ نیز یہ کہ اگر یہ جزوِ خداوندی انسانوں کے جسم میں داخل کردیا گیا تو ہر شخص تھوڑی بہت

الوہیت کا حامل ہوجائے گا۔ اصل یہ ہے کہ یہ اضافت اضافتِ تشریفی ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو اپنی طرف منسوب کرکے اس کی عزت وتوقیر میں اضافہ کرتا ہے۔ قرآن کریم میں کعبہ کو بیتی (میرا گھر) 2/125، 22/26، 71/28، ان تین مقامات میں ارشاد فرمایا ہے۔ پھر سورہ عنکبوت میں فرمایا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ (29/56) (ترجمہ) میری زمین کشادہ ہے۔ ان مقامات پر اللہ تعالیٰ نے، میرا گھر اور میری زمین کہہ کر ان دونوں چیزوں کو عزت بخشی ہے۔ یہ دونوں چیزیں اس کا جز نہیں ہیں بلکہ اس کی طرف منسوب ہیں اور یہ اضافت، اضافتِ تشریفی کہلاتی ہے، دوسری چیز قابل بیان یہ ہے کہ جب یہ روح خداوندی، یعنی سماعت وبصارت اور غور وفکر کرنے کی صلاحیت، نوع انسانی کو ملتی ہے تو قرآنِ کریم اس کو نفس کے لفظ سے تعبیر کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی انسانی ذات ہے یہی خودی اور Self ہے۔ یہ ہر انسان کو یکساں طور پر ملتی ہے۔ اسی نفس کی نشوونما کو قرآنی ''روحانیت'' کہہ سکتے ہیں۔ یہ صرف قرآنی معاشرہ میں حاصل ہوسکتی ہے۔ ہم نفس کے موضوع پر آئندہ گفتگو کریں گے۔

اس مضمون میں ہم چار عنوانات پر اپنی معروضات پیش کریں گے۔

(1) روح انسانی کی تردید

(2) نفس انسانی کا تعارف

(3) تخلیق انسانی کا طریقہ یعنی مسئلہ ارتقاء

(4) قرآن کریم میں روح کا لفظ بیس (20) مقامات پر آیا ہے۔ روحٍ، روح''، روحی، اور ردحنا استعمال ہوا ہے۔ ہم روح کی پوری پوری وضاحت کرنے کی غرض سے ان تمام آیات کے مفہوم بھی عرض کریں گے۔

قرآن کریم میں روحِ انسانی کا کسی ایک جگہ بھی تذکرہ نہیں ہے۔ البتہ چند وضعی روایات ہیں کہ جن کی وجہ سے ہمارے مفسرین سے اس بارے میں لغزش ہوئی ہے۔ آپ پہلے وہ روایات ملاحظہ فرمائیں۔

1۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ نے آدم کو پیدا کیا تو اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا تو اس کی پشت سے ارواح نکلیں جن کا اللہ تعالیٰ خالق ہے آدم کی اولاد سے قیامت کے دن تک۔ مشکوۃ شریف، باب الایمان بالقدر۔

(2) رسول اللہؐ نے فرمایا اللہ نے آدم کو جس وقت پیدا کیا تو ان کے دائیں شانہ پر ہاتھ مارا جس سے چھوٹی چیونٹیوں کی طرح ان کی ساری گوری نسل نکل پڑی اور بائیں شانہ پر ہاتھ مارا تو کوئلہ کی طرح سیاہ نسل نکل پڑی۔ دائیں طرف والوں کے

متعلق رسول اللہؐ نے فرمایا یہ جنت کی طرف جانے والے ہیں اور مجھے ان کی اطاعت کی پروانہیں اور بائیں شانہ والوں کے متعلق فرمایا یہ دوزخ کی طرف جانے والے ہیں اور مجھے ان کی نافرمانی کی کوئی پروانہیں۔

(3) اس مضمون کی بہت روایات، کتبِ روایات میں مل جاتی ہیں کہ اللہ نے جب آدم کو پیدا کیا تو اسی وقت آدم کی پشت سے وہ تمام ارواح پیدا کرلیں جو قیامت تک پیدا ہونے والی ہیں۔ مفسرین کا خیال یہ ہے کہ یہ کسی ایک وقت میں وقوع ہونے والے کسی واقعہ کا ذکر ہے۔ حالانکہ یہ صورت نہیں ہے۔ روایات کی بناء پر مفسرین نے یہ عقیدہ اپنے ذہن میں پکا کرلیا۔ اس کے بعد آپ ملاحظہ فرمائیں کہ وہ کس طرح قرآن کو بھی اس واقعہ میں لپیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ارشاد عالی ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى (7/172) (ترجمہ) اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کے پٹھوں سے ان کی اولاد کو اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب، بولے ہاں ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کے ترجمہ میں تو تحریر فرمایا ''تیرے پروردگار نے آدم کی اولاد کی پشت سے ان کی اولاد پکڑی''۔ یہ ترجمہ بالکل درست ہے۔ لیکن آپ حیران ہوں گے کہ ان ہی شاہ صاحب نے اس کے حاشیہ میں تحریر فرمایا ''روز میثاق میں آدم سے اس کی اولاد پیدا کی۔'' ترجمہ اور حاشیہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ کھلم کھلا علمی دیانت کے برعکس ہے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ روایات ہیں۔

ہمارے مفسرین عربی ادب کے ماہر اور اس کے امام ہے۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ وہ روایات کی وجہ سے کس طرح عربی زبان کی غلطیاں کرجاتے ہیں۔ اس آیہ کریمہ میں الفاظ اَخَذَ، اَشْهَدَ، قَالُوْا ماضی کے صیغوں میں آتے ہیں لیکن عربی زبان میں وہ قواعد موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ ماضی کے صیغے مضارع کے معنے میں استعمال ہوتے ہیں۔ اور قواعد کوئی منتہی کتابوں میں نہیں، علم نحو کی ابتدائی کتابوں میں موجود ہیں۔ ہم ان کو یہاں اس لیے نقل نہیں کرتے کہ اس سے مضمون طویل ہوجائے گا اور وہ قواعد عام قارئین کی دلچسپی کے بھی نہیں ہیں۔ لیکن ہم اس کی مثالیں خود قرآن سے پیش کردیتے ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہے وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مَّآءً (23/18) وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا (2/22)، آپ ملاحظہ فرمائیں کہ اَنْزَلَ اور فَاَخْرَجَ دونوں ماضی کے افعال ہیں لیکن ان کا ترجمہ حال میں کرتے ہیں۔ اس کا ماضی کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ نے ماضی کے کسی زمانے میں آسمان سے پانی برسایا اور پھر اس کے ساتھ میووں سے رزق نکالا۔ اب آپ خود ملاحظہ فرمائیں کہ یہ معنی کس قدر غلط ہیں۔ ان ماضی کے افعال کا ترجمہ سنت جاریہ ہونے کی وجہ سے حال میں کیا جاتا ہے۔ آیت کا درست ترجمہ یہ ہے (اے رسول) وہ وقت قابل ذکر ہے جب آپ کا پروردگار بنی آدم کی پشتوں سے ان کی

اولاد کو پیدا کرتا ہے۔ آیت کے اس درست معنی کی وجہ سے روز میثاق کی پوری طرح تردید ہو جاتی ہے۔

اب ہم آپ کے سامنے وہ آیات کریمات پیش کرتے ہیں جن سے روح کے عقیدے کی تردید ہوتی ہے۔

روح انسانی کے متعلق روایتی نظریہ یہ ہے کہ رحم مادر میں جب جنین چار ماہ کا ہو جاتا ہے، تو چار ماہ کے بعد اس جنین میں روح ڈال کر اس کو زندہ کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ابتدائی نظریہ ہی غلط ہے۔ کیونکہ جنین تو اوّل دن سے ہی زندہ ہوتا ہے۔ زندہ جسم کی ہر چیز زندہ ہوتی ہے۔ اب تو Medical Seience سے یہ بات ثابت ہے کہ جسم سے خارج شدہ مادہ تولید زندہ ہوتا ہے۔ اور خوردبین کے کا ذریعہ اس کی حرکت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد عالی ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً (23/12) رحم مادر میں نطفہ کو اس طرح رکھ دینے کے بعد نطفہ جو ارتقائی مراحل طے کرتا ہے اس کو بیان فرمایا ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (23/14) (ترجمہ) پھر ہم نے نطفہ کو جما ہوا خون بنایا۔ پھر ہم نے منجمد خون کو گوشت کا لوتھڑا بنایا پھر ہم نے لوتھڑے کی ہڈیاں بنائیں پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم نے اس کو ایک دوسری صورت میں پیدا کیا۔ تو خدا بابرکت ہے جو سب بنانے والوں میں سب سے بہتر ہے۔ رحم مادر میں نطفہ یہ پانچ مراحل (Stage) طے کرنے کے بعد انسانی بچہ بنتا ہے۔ آپ خود اس بات پر غور فرمائیں کہ کیا یہ پانچ مراحل بے جان چیز طے کر سکتی ہے۔

آپ اس آیت پر غور فرمائیں اور اسی مضمون کو بیان کرنے والی اور آیات بھی قرآن میں ہیں۔ جو متعدد جگہ ہیں اور بار بار آتی ہیں۔ لیکن کسی ایک جگہ بھی کہیں ادخالِ روح کا کوئی تذکرہ قرآن میں نہیں ہے۔ اگر روح کا کوئی تصور ہوتا تو ادخال روح کا ذکر ضرور ہوتا۔

ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ (22:5) (ترجمہ) لوگو اگر تم کو مرنے کے بعد دوبارہ جی اُٹھنے میں کسی طرح کا شک ہے تو اس میں شک نہیں کہ ہم نے تمہیں مٹی سے اس کے بعد نطفہ سے، اس کے بعد جمے ہوئے خون سے پھر اس لوتھڑے سے جو پورا (سڈول) ہو یا ادھورا ہو، پیدا کیا ہے تاکہ تم پر ظاہر کریں (کہ تمہارا زندہ کرنا مشکل نہیں ہے) ہم عورتوں کے پیٹ میں جس (نطفہ) کو چاہتے ہیں ایک مدتِ معینہ تک ٹھہرا رکھتے ہیں۔ پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں تاکہ اپنی جوانی کو پہنچو اور تم میں سے کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو بڑھاپے سے قبل ہی مر جاتے ہیں۔

قرآن کریم انسانی روح کا ذکر کسی جگہ بھی نہیں کرتا۔ اس نے روح خداوندی کا ذکر کیا ہے اور جب یہ روح خداوندی (الوہیاتی توانائی) انسان کو عطا کردی جاتی ہے تو اس کو قرآن کریم کی اصطلاح میں نفسِ انسانی کہا جاتا ہے۔ (91/7-9) میں آپ سے محوِ گفتگو ہوں اور اپنا کوئی واقعہ آپ کو سنا رہا ہوں کہ کل میں اپنے ایک دوست سے ملنے گیا راستہ میں اتفاق سے میں گر پڑا تو میری ٹانگ میں معمولی سی چوٹ آئی۔ میں نے اپنے دائیں ہاتھ سے اس جگہ کو مالش کیا تو میرا سانس پھول گیا۔ مگر میری ٹانگ کو بہت آرام وسکون ملا۔ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ میں اپنی گفتگو میں بار بار میں، میرا، میری استعمال کر رہا ہوں۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ ''میں'' کیا چیز ہے۔ میرا ہاتھ، میرا پاؤں، میری جان، میرا جسم سب اضافی چیزیں ہیں یہ اصل چیز نہیں ہے جو زندگی کا محور اور اس کی اساس و بنیاد ہے۔ قرآن کریم نے انسانی اور حیوانی جنین کے تمام مراحل شمار کرائے ہیں جن سے انسان اور حیوانات کے بچے رحم مادر میں گذرتے ہیں۔ اس کے بعد قرآن نے حیوانی جنین کے مراحل کے بعد انسانی جنین کے متعلق فرمایا: ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (23:14) ''پھر ہم نے اسے دوسری صورت میں پیدا کیا۔ یعنی یہ کہ یہاں پہنچ کر انسان دوسرے حیوانات سے مختلف قسم کا ہوگیا۔ یہ ہے وہ انسانی منفرد خصوصیت جس سے انسان حیوانی سطح سے بلند ہوکر انسانیت کی سطح پر آجاتا ہے یہ وہ مقام ہے یہاں انسان میں وہ توانائی آجاتی ہے جسے خدا نے اس کو عطا فرمائی ہے۔

انسانی زندگی کے دو مختلف زاویہ نگاہ ہیں۔ ایک دوسرے کے متناقض اور ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ ایک نظریۂ حیات تو یہ ہے کہ یہ جو انسان ہے یہ صرف طبعی جسم رکھتا ہے۔ سلسلۂ ارتقاء کی رُو سے یہ Protoplasm سے ترقی کرتا ہوا پیکر انسانی تک پہنچ گیا۔ اس کا جسم ایک مشین کی مانند ہے۔ اس کے جسم پر طبعی قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔ اچھی غذا کھانے سے عرصہ حیات طویل ہوجاتا ہے۔ جو شخص اپنے جسم کو بُری طرح استعمال کرے گا اس کی زندگی کا عرصہ کم ہوگا۔ نہ زندگی کا کوئی مقصد ہے اور نہ کوئی مطمح نگاہ۔ موجودہ دور میں بھی یہ نظریہ عام طور پر رائج ہے۔

دوسرا نظریۂ حیات یہ ہے کہ انسان میں اس کے جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے اور اس کو ''میں'' کے لفظ سے متعارف کرایا ہے۔ یہ ''میں'' انسانی ذات، اس کی خودی، اس کا Psyche ہے۔ اس ہی کی وجہ سے انسان کو اختیار وارادہ ملا ہے۔ انسان کا ہر عمل اس کی اس ''میں'' کو متاثر کرتا ہے۔ اس ''میں'' کی پرورش کرکے، اس کو پختہ کرنا انسان کا مقصود حیات ہے۔ موت انسان کے جسم کو آتی ہے۔ اس ''میں'' کو کبھی موت نہیں آتی۔ علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

یہ نکتہ سیکھا میں نے بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

دانش کا شعر ہے ؎

موت کے صدمہ سے کم ہوتی نہیں ہے زندگی
اس طرف بھی زندگی ہے، اُس طرف بھی زندگی

اس ''میں'' کی تربیت اور پرورش مستقل اقدار کے ذریعے ہوتی ہے۔ جو قرآن کریم نے عطا کیے ہیں۔ جسم کی پرورش طبعی قوانین کے ذریعے ہوتی ہے۔ لیکن ذات کی پرورش وحی الٰہی کی عطا کردہ مستقل اقدار کے ذریعے ہوتی ہے۔ تزکیہ نفس، یعنی انسانی مضمر صلاحیتوں کو پورا پورا نشوونما دینا، بھی وحیٔ خداوندی پر عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے ''ضمیر'' اور ''حافظہ''، انسانی ذات کی خصوصیات میں انسان جب فوت ہوتا ہے تو اس کی وہ تمام چیزیں جس کو وہ میری کہتا ہے۔ سب یہاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ یہ کروڑوں اور اربوں روپوں کے اثاثے اور غبن، یہ سوئس بنک کے Balances کچھ کام نہیں دیتے۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ، انسان کا صرف یہ ''میں'' اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ آگے جاتا ہے وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (6/94) (ترجمہ) اور آخر تم ہمارے پاس اسی طرح تنہا آئے جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔

قارئین کرام کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ جس تصورِ حیات میں انسان کے ساتھ ''میں'' کا تصور لازمی ہے تو اگر اس ''میں'' کو نفس کی بجائے روح ہی مانا جائے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اکثر حضرات کو یہ اعتراض Confuse کرتا ہے۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ اوّل تو یہ بات حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ قرآن نے روح کا کوئی تصور دیا ہی نہیں ہے۔ قرآن کریم نے خود نفسِ انسانی کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کی تربیت اور پرورش کے اصول بھی بتائے ہیں۔ سارے قرآن میں ''روحانیت'' کا لفظ ہی نہیں آیا۔ نہ قرآن نے روحانیت حاصل کرنا یا روحانیت میں اضافہ کرنے کا کوئی اصول دیا ہے۔ ہمارے علماء کرام اور صوفیائے عظام روحانیت حاصل کرنے کے لیے جو رسوماتِ پرستش سرانجام دیتے ہیں۔ جنگلوں، صحراؤں، پہاڑوں میں مجاہدے کرتے ہیں۔ ان کا کوئی تذکرہ قرآن میں نہیں ہے۔ یہ حضرات مادہ کو روح کا مخالف قرار دے کر دنیا سے نفرت اور بیزاری پیدا کرتے ہیں۔ یہ انسانی حواس سے حاصل کردہ علم کو Condemn کرتے ہیں اور صرف باطنی علم کو تسلیم کرتے ہیں۔ روحانیت کے تصور میں وہ چیز شامل ہے جس سے قوم کو زوال حاصل ہوتا ہے اور یہ اجتماعی زندگی کی مخالف اور انفرادی زندگی کی قائل ہے۔

اس کے برخلاف نفسِ انسانی ایک حقیقت ہے۔ روح کا اِدخال انفرادی طور پر تصور کیا جاتا ہے کہ ہر جنین میں روح داخل کی جاتی ہے۔ جبکہ نفس انسانی کی حقیقت یہ ہے کہ جب زندگی حیوانیت کے درجہ سے بلند ہوکر، پیکر انسانی میں آتی ہے تو نفس انسانی اس کا ایک Inbuilt، Inherent حصہ ہوتی ہے۔ نفسِ انسانی کے بغیر زندگی انسانیت کے معیار پر آ ہی نہیں سکتی۔ یہ ایک اجتماعی اور نوعی خصوصیت ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے۔

نفس انسانی کی تربیت کے جو اصول قرآن کریم نے بتائے ہیں، اس سے قوم ترقی کرتی ہے۔ جو امور نفس انسانی کی نشوونما کے لیے سرانجام دیئے جاتے ہیں ان سے مملکت کا نظام درست ہوتا ہے اور قوم عروج حاصل کرتی ہے۔ ایک شخص جو اس لئے چوری نہیں کرتا کہ چوری کرنے سے اس کے نفس پر بُرے اثرات مرتب ہوں گے، تو لوگوں کا چوری نہ کرنا معاشرے کو اچھا بنانے میں مددگار ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت کے شہری جرائم کا ارتکاب اس وجہ سے نہیں کرتے کہ جرائم کے ارتکاب سے ان کی نفس پر بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ نفسِ انسانی کی بیداری اور نمود کا مقام وہ ہوتا ہے جہاں انسان کا دوسرے انسان سے واسطہ پڑتا ہے۔ نفس کی نمود دوسروں پر اپنا مال خرچ کرنے سے ہوتی ہے۔ (92/18) نفس کی پرورش صرف اس معاشرے میں ہوتی ہے جس معاشرے کا ہر فرد دوسرے افراد کی پرورش اور ان کی ربوبیت کرتا ہے۔ یہ معاشرہ رَبّانیون پر مشتمل ہوتا ہے (3/79) اس معاشرہ میں ہر فرد دوسروں کے لیے زندہ رہتا ہے اور دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتا ہے وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (59/9) ترجمہ: وہ دوسرے پر ایثار کرتے ہیں خواہ انہیں کتنی ہی تنگی کیوں نہ ہو۔ اس قسم کا معاشرہ صرف اُس ایمان کے ذریعے قائم ہوتا ہے جس میں ہر شخص نفس انسانی پر یقین رکھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ ہر فرد کی نفس اس وقت پرورش پاتی ہے جب وہ دوسروں کی نفس کی پرورش کرتے ہیں۔

اگر زندگی صرف اس جسم کی زندگی ہے تو پھر اس کے بعد اصول و اقدار کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اس صورت میں تو صرف مملکت کے قوانین کی پاسداری ہی لازمی رہ جاتی ہے۔ لیکن اس مملکت میں، مملکت کی اطاعت جبراً کی جاتی ہے۔ اور جو لوگ ایسا بندوبست کرلیں کہ وہ مملکت کی گرفت سے بالاتر ہوجائیں تو پھر اُنہیں جرائم کے ارتکاب سے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ صرف نفس انسانی پر محکم یقین ہے جو انسان کو جرائم سے روکتا ہے۔ اور اس طرح نفس کے تصور پر ہی نظام سیاست کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اور یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ وہ نفس کی اساس پر مملکت کی تعمیر کرتا ہے۔ قرآن کریم کے علاوہ انسانی ذہن کی وضع کردہ کسی مملکت میں یہ تصور پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ نفس کے تصور کے بغیر کسی ملک میں بھی جرائم کا انسداد ہو ہی

نہیں سکتا مملکت کے باشندوں کا یہ یقین کہ جرائم کے ارتکاب سے نفس پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں مملکت میں امن وامان Stability قائم رکھتا ہے۔

کمیونزم کا نظام صرف اس وجہ سے ناکام ہوا کہ اس میں محنت کر کے اپنی حاصل کردہ کمائی کو دوسروں پر صرف کرنے کا کوئی Incentive (جذبہ محرکہ) نہیں تھا۔ ایک شخص کی اگر سو روپے کی ضرورت ہے تو وہ دو سو روپوں کا کام کیوں کرے۔ اسلامی مملکت میں نفس کا تصور وہ جذبہ محرکہ فراہم کرتا ہے جس کی وجہ سے آدمی زیادہ سے زیادہ محنت کر کے اپنی کمائی کو دوسروں پر خرچ کرتا ہے۔ ارشاد عالی ہے الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی (92/18) جو شخص اپنا کمایا ہوا مال دوسروں پر خرچ کرتا ہے اس کا نفس اپنی ساری صلاحیتوں کو اجاگر کر لیتا ہے اَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (64/16) (ترجمہ) اپنی بہتری کے واسطے (دوسروں) پر خرچ کرو اور جو شخص حرص سے بچ گیا تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔ ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ (2/272) تم جو کچھ بھی (مملکت کے) نیک کاموں میں خرچ کرتے ہو تو اپنے نفس کے لیے کرتے ہو۔ ارشاد عالی ہے وَمَنْ یَّبْخَلُ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ (47/38) جو کوئی بخل کرتا ہے تو وہ اپنے نفس کے لیے ہی بخل کرتا ہے۔ ارشاد ہے وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ (34/39) (ترجمہ) اور جو کچھ بھی تم لوگ خرچ کرتے ہو اس کا عوض ملے گا۔ دوسروں کی پرورش کرنے سے اپنی پرورش ہوتی ہے۔ یہ قرآن کا مسلمہ اصول وقانون ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی مملکت میں سب شہریوں کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اس میں کنوارے کے لیے ایک حصہ تھا اور شادی شدہ کے لیے دو حصے تھے۔ اس تقسیم میں کسی شخص کو اس کی ذاتی خدمات کی وجہ سے کوئی برتری حاصل نہیں تھی۔ اس پر بعض حضرات نے حضرت ابوبکرؓ سے گذارش کی کہ جن لوگوں نے اسلام کی خدمت کرنے میں اپنی ساری عمریں لگا دیں آپ نے ان کو سابقین کے برابر کر دیا اور ان کو ان کی خدمات کا کوئی بدلہ نہیں دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا میں بحیثیت سربراہ مملکت سب کو روزی فراہم کرنے کا ذمہ دار ہوں۔ باقی رہی اسلام کی خدمات تو اس کا بدلہ آخرت میں اللہ کے ہاں سے ملے گا۔ آخرت میں بدلہ ملنے کا تصور صرف نفس پر یقین لانے سے پیدا ہوتا ہے۔ نفس پر یقین کرنے کا لازمی نتیجہ۔ ایمان بالآخرت ہوتا ہے۔ روح کی تردید کا منطقی نتیجہ مسئلہ ارتقاء کو تسلیم کرنا ہے کہ روح کے مسئلہ ارتقاء کو درست تسلیم کرنا، روح کے تصور کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔

آخری قسط

راجہ عبدالعزیز (دھیرکوٹ آزاد کشمیر)

متحرک نفسیات

Dynamic Psychology

تحلیل نفسی کی برادری میں ایک اہم اور نامور مشہور ماہر نفسیات ایرک فرام (Erich Fromm 1900-1980) کی شخصیت بھی ہے۔ اس کا تعلق جرمنی سے تھا اور تحلیل نفسی کے ذریعے مریضوں کا علاج کرتا تھا۔ فرائڈ کا بنیادی طور پر پیروکار تھا، مگر اکثر مسائل میں اس سے اختلافات بھی رکھتا تھا۔ فرائڈ نے کارل کارکس کے نظریات کی سختی سے تردید کی تھی، لیکن فرام، مارکس کے نظریات کے گہرے مطالعے کے بعد کافی حد تک مارکس کے نظریات سے متاثر ہو گیا تھا۔ فرام نے اپنے وسیع مطالعے، مشاہدے اور تحقیقات کی روشنی میں انسانی شخصیت کی تکمیل کے عمل کو ایک وسیع تر تناظر میں دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ دوسرے محققین نے شخصیت کی تشکیل کے عمل میں معاشرتی عوامل کے کردار کو صرف جزوی طور پر واضح کیا ہے۔ مثلاً اڈلر نے زیادہ تر خاندان کی بات کی ہے اور سلی ون نے شخصی تعلقات (Interpersonal Relations) کو مرکزی حیثیت دی ہے، جبکہ حقیقی معاشرے کے دیگر بہت سے پہلو ہوتے ہیں جو فرد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کا ایک مخصوص معاشی، سیاسی اور معاشرتی نظام ہوتا ہے۔ انسان اور معاشرے کے مابین ایک دوسرا بڑا اہم پہلو یہ ہے کہ ان کے درمیان دوطرفہ تعلق ہوتا ہے۔ یعنی اگر معاشرہ ایک طرف افراد پر اثر انداز ہوتا ہے تو دوسری طرف معاشرے کی تشکیل بھی انسان ہی کرتے ہیں۔ تغیر پذیر معاشرے میں جب مختلف طبقات پیدا ہو جاتے ہیں تو معاملہ مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ مختلف معاشی حیثیتوں کے افراد میں کشمکش اور اپنے اپنے مفاد کے حصول کے لیے ایک دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ 102/1۔ ذرائع پیداوار کے مالکان کے لیے اپنی بنیادی ضروریات کی تسکین کوئی مسئلہ نہیں ہوتی، بلکہ وہ پُرتعیش زندگی گذارتے ہیں اور محض دولت کے گھمنڈ میں آکر اپنے آپ کو دوسروں سے برتر و اعلیٰ تصور کرتے ہیں۔ جبکہ معاشی لحاظ سے محروم طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی پوری زندگی بنیادی ضروریات کی فراہمی اور ان کی تسکین کرنے کے اہتمام میں بیت جاتی ہے اور ہر وقت بے یقینی اور تشویش کا شکار رہتے ہیں، کیونکہ انہیں کبھی بھی اس بات پر یقین نہیں ہوتا کہ ان کی بنیادی ضرورتیں تسلی بخش طور پر پوری ہوتی رہیں گی۔

ایرک فرام نے اس سلسلے میں چند مخصوص قسم کے شخصیاتی رجحانات کا ذکر کیا ہے۔ جس میں ''تجارتی شخصیت''، ''استحصالی شخصیت'' اور ''ذخیرہ اندوز شخصیت'' شامل ہیں۔ عبدالحمید نے استحصالی شخصیت کے بارے میں فرام کے تصورات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ''استحصالی طبقے مختلف حیلے بہانوں سے اپنی دولت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے عوام کی مشکلات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ان کے خریدے ہوئے علماء، دانشور، وکیل، پروفیسر، ادیب اور شاعر غیر منصفانہ نظام کے حق میں مذہبی، سیاسی، معاشرتی،

ادبی اور نام نہاد سائنسی تاویلیں گھڑ کر پیش کر دیتے ہیں اور عام آدمی کو باور کروانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ نظامِ معاشرت عین فطری ہے یہی قدرت کا نظام ہے۔ چنانچہ ماضی میں کبھی غلامی کے جواز میں دلائل پیش کئے گئے اور کبھی ذہنی محنت کو جسمانی کام سے برتر قرار دیا گیا، کبھی مذہبی علماء، رومانوی عاشق مزاج ادیب اور نصابی فلسفی عوام کو سمجھاتے ہیں کہ دنیاوی زندگی غیر اہم ہے اور اصل زندگی مابعد الطبعیاتی ہے۔ ان حقائق کو ذہن میں رکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس قسم کے معاشرتی اور معاشی حالات میں کس قسم کی شخصیت نشوونما پائے گی۔''

یہ ایک عظیم نفسیات دان کے نظریات تھے، استحصالی نظام کے بارے میں جنہیں ایک دوسرے نفسیات دان نے بیان کیا ہے۔

ایک اور نفسیات دان پروفیسر ساجدہ زیدی نے ایرک فرام کے انہی خیالات کو یوں بیان کیا ہے۔ ''تجارتی اور استحصالی طبقے کا زاویہ نگاہ ہی استحصالی ہوتا ہے جو دوسروں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ''استعمال'' کرتا ہے۔ یہ لوگ کمزوروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی آسودگی کا ذریعہ ہر وہ چیز (منصب یا دولت، شہرت یا ملکیت، جاہ وحشم، یا مادی اشیاء) ہوتی ہے جسے وہ دوسروں سے ''چھین'' کر غصب کر سکیں یا دھوکے فریب کے ذریعے حاصل کر سکیں۔ اپنی محنت کی روزی پر وہ مطمئن نہیں رہ سکتے۔ یہ ٹائپ ہر اس سماج میں موجود ہوتا ہے جس میں سرمایہ دارانہ نظام ہو یا طبقاتی امتیاز ہو، بھوک، غربت اور محرومی ہو یا سماج کا معاشی نظام استحصالی ہو۔ ایرک فرام نے اسے ڈاکوانہ سماج کی خصوصیات بتایا ہے۔ یہ ٹائپ تقریباً ہر سماج میں موجود ہوتا ہے۔ اس ٹائپ کے افراد بھی ''عزتِ نفس'' خودداری اور احترام ذات کے توانا احساسات سے محروم رہتے ہیں۔ اور اکثر لاشعوری طور پر خود سے نفرت کرتے ہیں اور تخفیفِ ذات کے مرتکب ہوتے ہیں۔'' یہاں میں ایک بات کا اضافہ کروں گا کہ اس استحصالی اور سلب ونہب کے نظام کے قیام اور استحکام کا باعث خود استحصال زدہ طبقے کے لُٹے اور کچلے ہوئے لوگ ہی ہوتے ہیں، جن کے ذریعے طاقتور استحصالی طبقہ کمزور اور مجبور طبقے کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھتا ہے۔

ایرک فرام نے انسان اور کائنات کے بنیادی رشتے کا سوال اٹھایا ہے۔ جو بقول ساجدہ زیدی ''فلسفیوں کے لیے تو نیا نہیں ہے لیکن نفسیات دانوں میں ایرک فرام وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ جرأت مندانہ قدم اٹھایا ہے۔ اس کے خیال میں وہ بنیادی مسئلہ جو تمام انسانوں کے لیے مشترک ہے، یہ ہے کہ فرد کائنات کے تناظر میں اپنے مقام ومنصب کا تعین کیسے کرے اور اپنی زندگی کے لیے معنی تلاش کیسے کریں اس کوشش میں سب سے پہلا ادراک اپنی ذات کا کرنا ہوتا ہے، اور وہ ذات اور کائنات کے رشتے کی مسلسل تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ یہی تلاشِ مسلسل انسان کے لیے فردیت کا عمل بن جاتی ہے۔ جس کوشش میں ایک طرف فرد کا اپنی ذات کا ادراک حاصل کرنا ہوتا ہے اور دوسری طرف سماج ومعاشرہ کے ساتھ اپنے رشتے کی حرکت کو محسوس کرنا ہے۔'' فرد کی بنیادی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ فرام کا دوسرا تصور انسانی آزادی کا تصور ہے۔ اس کے نزدیک آزادی نوع انسانی کا بنیادی وصف ہے، لیکن حصولِ آزادی کی جدوجہد فرد کے لیے اکثر اوقات مشکل ترین مرحلہ بن جاتی ہے۔ عبدالمجید کے مطابق ''انسان کا ماضی اس کی بنیادی ضروریات کی تسکین کی خاطر جدوجہد کا ایک مسلسل عمل نظر آتا ہے جس کے نتیجے میں انسان نے ترقی کی اور اس کی ضرورتوں کی تسکین زیادہ یقینی ہوگئی۔ انسان جس قدر زیادہ ترقی کرتا گیا، اسی لحاظ سے زیادہ آزاد ہوتا گیا۔ تاہم اس کے نتیجے میں وہ فطرت اور اپنے عزیز واقارب سے دور ہوتا گیا۔ اپنے آپ کو تن تنہا اور اکیلا محسوس کرنے لگا، جس سے تشویش اور عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا۔ فرام کا خیال ہے کہ یہ صورتحال صرف انسان کو درپیش ہے دوسرا کوئی جاندار تنہائی کے اس قسم کے احساس سے دوچار نہیں ہوتا۔ فرام نے اس

تصور کی وضاحت بچے کی مثال دے کر کی ہے۔'' تشویش اور اکیلے پن کے احساس سے بے بسی، غیر محفوظ اور کمزوری محسوس کر کے انسان دو میں سے ایک راستہ اپناتا ہے۔ پہلا راستہ تعمیل پسند (conformity) کا ہے۔ یعنی صورتحال سے خائف ہو کر انسان انفرادی آزادی کو ترک کر کے وہی کچھ کرنا شروع کر دیتا ہے جو اس کے گرد و پیش کے لوگ کرتے ہیں۔ اس طرح وہ لوگوں کی خوشنودی حاصل کر کے خود کو محفوظ اور طاقتور سمجھتا ہے۔ یوں وہ تشویش اور اکیلے پن کے احساس سے چھٹکارا تو حاصل کر لیتا ہے، لیکن وہ اپنی آزادی اور انفرادیت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ عبدالحمید کے مطابق ''شخصیت کی نشوونما کا یہ انداز جاگیردارانہ معاشرے میں واضح طور پر نظر آتا ہے جہاں روایات سے ہٹ کر اپنی آزادی سے فیصلے کرنے کے عمل کو 'بغاوت' 'نافرمانی یا خاندان کی عزت سے کھیلنے کا نام دیا جاتا ہے۔'' پروفیسر ساجدہ کے مطابق فرام نے اسی رجحان کو ذات سے علیحدگی (Self Alienation) کا پیش خیمہ قرار دیا ہے۔ جب انسان اپنی آزادی کا بارگراں اتار پھینکتا ہے۔ اور اپنے جذبہ و عمل سے کٹ کر اپنی صلاحیتوں اور خلاقانہ قوتوں سے بھی رشتہ منقطع کر لیتا ہے۔

تشویش، بے بسی اور اکیلے پن کے خوف سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے، ایرک فرام کے مطابق، انسان کے سامنے دوسرا راستہ، انفرادی نشوونما کا راستہ ہے۔ یعنی انسان اپنی مرضی سے ایک راستے کا انتخاب کرتا ہے، کامیابی کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ مخالفت کا ہمت و جرأت سے مقابلہ کرتا ہے۔ ناکامی کی صورت میں دل برداشتہ نہیں ہوتا بلکہ نئے عزم اور ولولے سے آگے بڑھتا ہے۔ اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور بامعنی عمل کے ذریعے اپنی انفرادیت کو مضبوط کر کے اپنی شناخت کو فروغ دیتا ہے۔ دوسروں پر انحصار کرنے کی بجائے ان کے ساتھ برابری اور عزت و محبت کا رشتہ استوار کرتا ہے۔ اپنی آزادی کا تحفظ اور اپنی ذمہ داریوں کو قبول کرتا ہے۔ انفرادی نشوونما کا راستہ مشکل ضرور ہے لیکن اس پر چل کر فرد کی انفرادیت اور آزادی مجروح نہیں ہوتی اور شخصیت کی نشوونما صحت مند خطوط پر ہوتی ہے۔ اور اکیلے پن کی جگہ یگانگت اور ہم آہنگی کے احساسات ابھرتے ہیں۔ بااین ہمہ میرے خیال میں اس پورے عمل (Process) کے دوران حق و باطل، غلط و صحیح اور اچھائی بُرائی کے امتیازات انسان کے پیش نظر رہنے چاہئیں۔ کیونکہ اپنے ارادے کی آزادی (Free will) کو حق بات کے جھٹلانے کی خاطر استعمال کرنا نہ صرف آزادی کا غلط استعمال ہے بلکہ اس کے نتائج انسانیت کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا فرد کو اپنی خودمختاری کے ساتھ اپنی ذمہ داری کا احساس بھی ہونا چاہئے۔

ماہر نفسیات عبدالحمید کے مطابق ''فرام کا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام نے فرد کی زندگی کے حالات قدرے بہتر ضرور بنائے ہیں، لیکن اس کے لیے انسان کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ اس کی ذاتِ چھن گئی، عزت نفس کا احساس مٹ گیا، اکیلے پن اور بے چارگی کے احساس سے دوچار ہوا، انسانی اقدار کا خاتمہ ہو گیا، دوسروں کے ساتھ مخلص کاروباری اور مشینی رشتہ باقی رہ گیا۔ اپنے کھوئے ہوئے وقار، عزت نفس، باہمی یگانگی، ہم آہنگی اور پیار کا متلاشی انسان اپنے اکیلے پن کے احساس کو کم کرنے کے لیے کئی طریقے اپناتا ہے لیکن سکون پھر بھی نہیں ملتا۔'' فرام کے مطابق ان طریقوں میں اطاعت پسندی (Submissiveness) کا ایک طریق ہے۔ اس ردِعمل میں انسان اپنی ذات کو کسی بیرونی طاقتور چیز سے جوڑ کر خود کو اکیلا محسوس نہیں کرتا۔ طاقتوروں سے دبنا کمزوروں کو ذلیل کرنا ایسے لوگوں کا عمومی طرزِ عمل بن جاتا ہے۔ کچھ لوگ دوسرا طریقہ، تخریبیت (Destructiveness) کا استعمال کرتے ہیں۔ اس صورت میں فرد اپنی بے بسی اور عدم تحفظ کے احساس کو دور کرنے کے لیے جارحیت پر اتر آتا ہے۔ جن افراد کو وہ اپنے مسائل کی وجہ سمجھتا ہے، انہیں کچلنے کے درپے ہو جاتا ہے۔ اور اکثر اوقات وہ اپنے عمل کو حق بجانب قرار دینے کے لیے کوئی مذہبی جواز تلاش کر لیتا

ہے اور یوں بزعم خود احساس جرم سے بچا رہتا ہے۔ میرے خیال میں فرام کا زمانہ اچھا تھا جب صرف اپنے مسائل کی وجہ سمجھنے والے کو جارح، جارجیت کا نشانہ بناتا تھا، ہمارے زمانے میں یہ تمیز ختم ہوچکی ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور طریقہ میکانکی مطابقت (Automation Conformity) کا ہے۔ اس قسم کے لوگ اپنی ذات کو نظر انداز کر کے دوسروں خصوصاً دولت مند اور مقبول لوگوں کا طرز عمل اپنا کر اپنے اکیلے پن اور تشویش وغیرہ کے احساسات کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگ مقبولِ عام اشیاء استعمال کرتے ہیں، معروف سٹوروں سے خریداری کر کے خود کو اہم لوگوں میں شامل تصور کرتے ہیں، مشہور اور مقبول خیالات اور چیزوں کو فوراً اپناتے ہیں اور اشتہارات سے جلد متاثر ہوتے ہیں۔ عبدالحمید کے نزدیک ''ہمارے ملک میں درمیانے طبقے کے زیادہ تر لوگ اسی قسم کا انداز زندگی اپنا کر تشویش اور اکیلے پن کے احساس کو کم کرتے ہیں۔''

نفسیاتی لحاظ سے فرد کے اپنی پوشیدہ تخلیقی اور تعمیری قوتوں کو بروئے کار لانے اور اپنی ذات کے اثبات و نمو کے لئے ایرک فرام کے نظریات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے عبدالحمید کہتے ہیں۔ ''فرام سے پہلے کسی محقق نے شخصیت کی تشکیل کے عمل کو سمجھنے کے لیے روزمرہ زندگی کے معاشی اور معاشرتی حالات کا بھرپور انداز سے جائزہ نہیں لیا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ فرام کے نظریات نے نفسیات کو ایک نئے رُخ پر ڈالا اور واضح کیا کہ معاشرے کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کس طرح فرد پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔ آج کے انسان کی سراسیمگی اور بیگانگی کو فرام کے نقطہ نظر سے بڑی آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔'' نفسیات دانوں میں ایک مکتبِ فکر کے ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ فرد کی شخصیت بنیادی طور پر آموزش (Learning) کے نتیجے میں تشکیل پاتی ہے اور اس عمل میں فرد کا گردوپیش کا ماحول مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ اس مکتب فکر کو کردار یت پسند اور ان کے نظریات کو Behaviouristic theorixes of Personality کہا جاتا ہے۔ آموزش کے اصولوں کا اطلاق کئی طریقوں سے کیا جاتا ہے، جن میں دو نظریات بڑے مشہور ہیں۔ پہلا ڈالرڈ اور ملر کا آموزش پر مبنی نظریہ شخصیت (Dollard and Muller's learning theory of personality) کہلاتا ہے، جس میں دو امریکی ماہر نفسیات جان ڈالرڈ اور نیل۔ ای۔ ملر نے تشریط (Conditioning) کے اصولوں کو بنیاد بنا کر شخصیت کی تشکیل کا نظریہ پیش کیا۔ اور دوسرا طریقہ معاشرتی آموزش پر مبنی نظریہ شخصیت کا (Social learning theory of personality) ہے یہ نظریہ بھی ایک امریکی کردار یت پسند محقق البرٹ بندورا نے پیش کیا تھا۔ اس کے نظریات پر بقول عبدالحمید کئی اعتراضات کئے گئے ہیں جن میں ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ ''اس نظریئے کی بنیاد جانوروں کے مطالعات سے حاصل ہونے والی اطلاعات اور نتائج پر رکھی گئی ہے۔ جبکہ انسانی کردار پر ان نتائج کا اطلاق کرنے کے لئے انسانی کردار کا وسیع پیمانے پر تجرباتی مطالعہ ضروری ہے۔'' شخصیت کی تشکیل کے انسانیت پسند نظریات (Humanistic theories of Personality) پر پہلے ہی کارل راجرز اور ابراہام ماسلو کے ضمن میں بات ہوچکی ہے۔ شخصیت کے موضوع پر لکھنے والے یہی تین مکاتیبِ فکر ہیں (1) تحلیل نفسی (2) کردار یت پسند اور (3) انسانیت پسند۔

انسانی شخصیت کے اوصاف، شعوری اور غیر شعوری اعمال وغیرہ پر کافی گفتگو ہوبھی چکی ہے مگر شخصیت کا پھیلاؤ یا گیرائی اور اس کا عمق یا گہرائی نیز اس کے رجحانات، میلان طبع، اقدار و رویے اور تعینات کے بے شمار پہلو ہیں جن کا ایک مضمون میں احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ ماہرین نفسیات نے ان پہلوؤں کے علاوہ شخصیت کے باطنی مثلاً لاشعوری محرکات وغیرہ کے عمیق گوشوں تک رسائی حاصل

کرنے کی کوشش کی ہے مگر شخصیت کے مختلف نظریات کے بنیادی تصورات کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں بنیادی قسم کے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یعنی انہیں ملا کر شخصیت کا ایک مکمل، مربوط اور معروضی نظریہ تشکیل نہیں دیا جا سکتا۔ عبدالحمید اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں۔ ''دراصل فرد کے کردار کی تہہ میں کام کرنے والے محرکات اور عوامل اس قدر پیچیدہ اور گوناگوں ہیں کہ اکثر اوقات ان کا احاطہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔'' انسانی شخصیت کے پیچ در پیچ اسرار و رموز، اس کے ہر لمحہ بدلتے ہوئے خیالات، ارادے اور سوچ اور نفسی و طبیعی نظاموں کے امتزاج و اشتراک پر مبنی حرکی و متغیر تنظیم انسانی کو سمجھنے کے لیے نفسیاتِ عمق (Depth psychology) کی مدد ضروری ہے۔ یہ نفسیات کی وہ عہد آفریں شاخ ہے جس نے نہ صرف نفسیات کے علم کا رخ بدل دیا بلکہ انسان کے تصور ہی کو بدل ڈالا۔ بقول پروفیسر ساجدہ نفسیات کی اس شاخ نے ''انسان کے اشرف المخلوقات کے منصب کا تصور ایک ایسے مجموعہ خیر و شر سے بدل دیا جس میں محض تخلیق و تعمیر و خیر کی صورتیں ہی جلوہ گر نہیں ہیں، بلکہ جس کے بطن میں تخریب کاری اور جارحیت کی قوتیں بھی اسی شد و مد سے عمل پیرا ہیں۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے جبلی افعال میں جانوروں سے زیادہ مختلف نہیں۔'' پروفیسر صاحبہ کی یہ بات تو میرے خیال میں درست ہے کہ انسان اور حیوان میں جبلی تقاضات تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ مگر ان کا یہ کہنا سمجھ میں نہیں آیا کہ تعمیر و خیر کی قوتوں اور تخریب و شر کی قوتوں کا مجموعہ ہونے کی بنا پر انسان کے اشرف المخلوقات کا منصب کیسے بدل گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انہی دو متضاد قوتوں پر کنٹرول کی وجہ سے ہی انسان کو یہ اعلیٰ منصب عطا کیا گیا ہے۔

شخصیت کی نفسیات (Psychology of Personality)، پروفیسر ساجدہ کے مطابق ''علم نفسیات کی شاید سب سے زیادہ پیچیدہ اور جامع شاخ ہے۔ یہی وہ علم ہے جو انسانی نشوونما کے زمانی و مکانی، داخلی اور خارجی، شعوری اور لاشعوری ہر پہلو کا احاطہ کرنے کا داعی ہے۔ اور یہی وہ نفسیات کی واحد شاخ بھی ہے جس کا علم اور تجربی مطالعہ محض انسانوں کے مشاہدے پر مبنی ہے، جبکہ ہم نفسیات کے اکثر شعبوں میں جانوروں کے تجربی مطالعے کی مدد سے نظریہ سازی میں استفادہ کرتے ہیں۔۔۔ لیکن انسانی شخصیت کی نفسیات کا علم جانوروں کے تجربی مطالعے کی مدد سے ممکن ہی نہیں ہے۔ اس امر سے قطع نظر، کہ انسانی نفسیات کے دوسرے شعبے بھی جانوروں پر کیے گئے تجربوں سے کسی حد تک اعتبار کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں۔'' شخصیت کی تعریف میں بھی اختلاف پائے جاتے ہیں۔ آلپرٹ (Allport) کے خیال میں ''شخصیت فرد کی ذات کے اندر ان طبیعی اور نفسی نظاموں کی حرکی تنظیم ہے جو انسان کے منفرد فکر و عمل کا تعین کرے۔'' یعنی شخصیت کوئی جامد شے نہیں بلکہ حرکی تنظیم ہے جو ہمہ وقت حرکت میں رہتی ہے۔ پروفیسر صاحب کے مطابق نفسی نظاموں کی یہ حرکی تنظیم، فرد کی ذات کے اندر ہوتی ہے۔ بیرونِ ذات اس کا وجود نہیں۔ ہاں بیرون ذات اس کے محض اظہارات اور محرکات ہو سکتے ہیں۔ شخصیت کے ضمن میں تحرک، تغیر، تبدیلی اور ارتقا پر ایک امریکی ماہر نفسیات Floyd.I.Ruch نے اپنی تصنیف "Psychology and life" میں تفصیل سے بحث و وضاحت کی ہے۔ اس نے اپنی کتاب کی ابتداء ہی عظیم و نامور دانشور تھامس کارلائل کے ان الفاظ سے کی ہے۔ " A hundred years ago Thomas Carlyle had this to say: " Today is not yesterday, we ourselves change, how can our works and thoughts always the same."

انسانی شخصیت کی ایک اور تعریف جرسلڈ نے یہ کی ہے۔ ''شخصیت فرد کی ان خصوصیات کا مجموعہ ہے، جن کا وہ بحیثیت ایک منفرد

مخصوص انسان کے، حامل ہے۔'' اس تعریف کے مطابق شخصیت ایک تنظیم نہیں بلکہ مجموعہ ٹھہرتی ہے۔ میکڈونلڈ کی تعریف کے تحت ''شخصیت فرد کے تمام کردار کی منفرد اور جامع تنظیم ہے۔'' جبکہ ہل گرڈ کے نقطہ نظر سے ''شخصیت کردار کی ان انفرادی خصوصیات کا نام ہے جو اپنی تنظیم کے ذریعے فرد کی اس کے تمام تر ماحول سے منفرد مطابقت کا تعین کرتی ہے۔'' واٹس کے نزدیک ''شخصیت ہمارے عاداتی نظام کا مجموعہ ہے۔ جس کا مطالعہ کردار کے ذریعے کیا جاتا ہے۔'' ان تعریفات میں انسانی شخصیت کی انفرادیت کو اہمیت تو دی گئی ہے مگر ماہرین کا اعتراض ہے کہ یہ تعریفیں نہ تو حرکی نظام شخصیت کا احاطہ کرتی ہیں، نہ شخصیت کی گہرایوں کا، نہ اس کے تغیرات کا اور نہ ہی یہ شخصیت کی ارتقائی کیفیت کی طرف کوئی واضح اشارہ کرتی ہیں۔ ان تعریفات میں رفتار کا نہیں بلکہ انجماد کا تصور ابھرتا ہے۔ اس لحاظ سے نفسیات کے انسائیکلوپیڈیا کی تعریف زیادہ بہتر لگتی ہے کہ ''شخصیت فرد کے بنیادی اور عمومی طرزِ عمل کی بلندیوں اور شعوری طور پر تصورذات کی پیمائش کا نام ہے۔ شخصیت کسی فرد کے جملہ انعکاسات، فطری میلانات، جذبات، علمی اور جسمانی استعداد کا وہ نظام ہے جو ہمیشہ تغیر وتبدل کے قانون کے زیر اثر رہتا ہے۔'' ان تعریفوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے نفی نہیں کرتی بلکہ ہر تعریف میں شخصیت کے کسی ایک پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ جناب عبدالحمید نے ان تعریفوں کی روشنی میں ایک ''جامع'' تعریف کرنے کی یوں کوشش کی ہے۔ ''شخصیت فرد کی کم وبیش مستقل اور منفرد خصوصیات کی متحرک تنظیم ہے۔ ان خصوصیات میں فد کے مخصوص کرداری نمونے، رویئے، محرکات، ہیجانات، میلانات، عقائد اور خیالات وغیرہ شامل ہیں۔ وہ گرد وپیش میں ہونے والے واقعات، اشیاء اور افراد کے بارے میں مخصوص انداز میں سوچتا ہے، احساسات کا اظہار کرتا ہے اور خاص ردِعمل پیش کرتا ہے۔'' شخصیت نفسیات کا ایسا وسیع اور اہم موضوع ہے جس کے مطالعے کے لیے دیگر موضوعات جیسے ادراک، محرکات، رویئے، آموزش، ہیجان، نشوونما اور حافظے وغیرہ سے حاصل کردہ معلومات کو اکٹھا کیا جاتا ہے۔ Floyed.L.Ruch نے اپنی تصنیف میں نفسیات کے تقریباً تمام نظریات کا احاطہ کیا ہے۔ اس نے انسانی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

انسانی شخصیت کی اصطلاح کے بارے میں رُچ (Ruch) کا کہنا ہے کہ اس سے مراد کوئی خاص معیار یا کوئی ایک پیمانہ نہیں۔ اس کے مطابق شخصیت کی تقریباً پچاس تعریفیں ہیں جو زیادہ تر "Most of these definitions attempt in one way, or another to include the whole person. - all the abilties, tendencies and other innate or acquired characteristics that are more or less consistent from one day to the next and distinguish him from other person." یہ کہتے ہیں کہ معاشرتی سائنس کے ماہرین جب لفظ شخصیت کا استعمال کرتے ہیں تو ان کے سامنے فلمی ستاروں یا سیاستدانوں کی پُراسرار (Mysterious) شخصیات نہیں ہوتیں بلکہ وہ عام فرد کی تین خصوصیات میں سے ایک کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو یہ ہیں۔

(1) His external appearance and behavior, or social stimulus value, (2) Awareness of self as a permanent organizing force in his life, or (3) His particular pattern or organization of measurable traits both inner and outer ones."

انسانی خصوصیات (Traits) کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ ابھی تک ان کی کوئی تعداد سامنے نہیں آئی تاہم But one early study, listed 17, 953 (Allport and Odbert 1936).The study of personality is especially dixfficult because each personaltiy is infinitely complex and contains apparantly contradicting aspects. As one psychologist has " expressed it."

یہ سائیکالوجسٹ مسٹر مرے (Marray) ہیں جنہوں نے شخصیت کے مختلف اور باہمی متضاد پہلوؤں کی بڑی مہارت اور خوبصورتی سے نشاندہی کی ہے۔ جیسا کہ رُچ نے بیان کیا ہے۔ " A personality is a full congress of orators and pressure groups, of childrens, demogogues, Communists, Isolationists, war-mongers, mugwamps, grafters, log-rollors, lobbyists, ceasars and christs. Machiavellis, and Judases, Torries and Promethean revolutionists."

رُچ کے مطابق کچھ ماہرین نفسیات نے زور دے کر اثباتِ ذات کے نظریے کو پیش کیا ہے۔

" From early childhood, the individuals concept of self is an important factor in guiding both his immediate behavior and the further development of his personality."

شخصیت کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے اس امر کا ادراک ضروری ہے کہ انسانی شخصیت مختلف النوع کرداری، تحرکی جبلی، شعوری، لاشعوری، فعلی اور امکانی عناصر کا ایک ایسا تنظیمی مجموعہ ہے جو ہمہ وقت تغیر پذیر اور نمو پذیر ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک مسلسل اور مربوط اکائی ہے۔ عبدالحمید کا کہنا ہے کہ شخصیت کا تصور عام ہونے اور اس کے بارے میں بہت کچھ جاننے کے باوجود اس کی صحیح نوعیت اور حقیقت کے بارے نہ صرف عام لوگوں میں بہت سے غلط تصورات پائے جاتے ہیں، بلکہ ماہرین میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ شخصیت کے ضمن میں سب سے پہلے متعلقہ شخص کا جسمانی حلیہ سامنے آتا ہے، یعنی فرد کے خدوخال، قد، چال ڈھال اور لباس وغیرہ جنہیں دیکھ کر ایک فرد کو اچھا یا بُرا سمجھا جاتا ہے۔ اسے قیافہ شناسی (Physiognomy) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح دست شناسی، علم نجوم، علم الاعداد اور علم دماغ (Phrenology) وغیرہ جیسے علوم بھی عوام وخواص میں بڑے مقبول ہیں، مگر عبدالحمید نے ایسے تمام تصورات کو بے بنیاد اور غیر سائنسی قرار دیا ہے۔ فلائیڈ رچ نے بھی ایسے علوم کو غیر حقیقی قرار دیا ہے۔ فرینالوجی کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ دماغ میں ایسی کسی صلاحیت کا سراغ نہیں ملا۔ " Modern research has found no thing to support the existence of " faculties as they were conceived by the Phrentologists. The only type of brain localization that actually is of general types of function - motxer, censor, speech and so on, as we have seen."

اسی طرح چہرہ شناسی (Physiognomy) کے بارے میں رُچ کا کہنا ہے کہ:

" Many people still believe in physiognomy, the art of judging personality from facial characteristics. But the accuracy of such Judjments is open to question."

زیادہ تر ماہرین نفسیات اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ شخصیت ایک حیاتیاتی طبعی وقوعہ (Biophysical event) ہے۔ مگر ایک دوسرے کی دی ہوئی تعریف سے کلیتاً اتفاق نہیں کرتے۔ شخصیت کی متعدد نفسیاتی تعبیریں پیش کی گئی ہیں اور بقول پروفیسر ساجدہ، ان تعبیروں کے تحت بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں مگر پھر بھی یہ تعریفیں مکمل طور پر شخصیت کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتیں۔ پروفیسر صاحبہ اس کی وجہ یہ بتاتی ہیں۔ ''انسانی شخصیت کے اسرار و رموز کی عقدہ کشائی کی ابتدائی کوشش بھی ایک لرزہ خیز تجربہ ہے۔ انسان مخلوقاتِ عالم کی پیچیدہ ترین نوع ہے۔ جو عقل و بصیرت، جبلت و شعور، محبت و خشونت، ادراک و احساس، الوہیت و شیطنت، ارتقاعی صلاحیت و ذہنی پستی، اعلیٰ و ادنی اور حسن و قبح کے ایسے ایسے تضادات سے نوازی گئی ہے جن کی یکجائی انسانی تخیل اور فہم سے پرے بے حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان کا بحیثیت ایک نوع کے تصور، ان تضادات کو سمجھے بغیر ممکن بھی نہیں ہے۔'' کچھ تعریفوں کے مطابق شخصیت ایک ایسا ''نظام'' ہوتی ہے جو مراتب کے اعتبار سے مختلف سطحوں میں منقسم ہوتی ہے اسے شخصیت کا درجاتی تصور بھی کہا جاتا ہے۔ اس نوع کی تعریفوں میں ولیم جیمس نے ذات کے چار درجات متعین کیے ہیں۔ اس کے نزدیک ذات دراصل شخصیت ہی کے باطنی نقطہ نظر سے مشاہدہ ہے۔ اس کی تقسیم کے مطابق ذاتِ انسانی کے چار درجات ہیں (1) ذاتِ مادی یعنی انسان کا جسم اس کی مادی ملکیتیں، دوست احباب وغیرہ (2) ذاتِ سماجی یعنی وہ ذات جو انسان سماجی رشتوں، شہرت اور پہچان سے حاصل کرتا ہے۔ (3) ذاتِ روحانی یعنی ذات کا وہ پہلو جو انسان کی منتشر شخصیت میں ربط و آہنگ پیدا کرتا ہے۔ اور ذات کا چوتھا درجہ ولیم جیمس کی نظر میں خالص ایگو یا انا ہے۔ جو اگرچہ ذاتِ روحانی سے الگ نہیں لیکن جس کی نفسیاتی تعبیر میں نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ لفظ شخصیت کا انگریزی مترادف "Personality" ہے یہ ایک لاطینی لفظ "Persona " سے ماخوذ ہے جو اسٹیج پر اداکار بطور ماسک استعمال کرتے تھے یعنی نقلی چہرہ۔

پروفیسر ساجدہ نے انسانی شخصیت کی تخلیقی صلاحیتوں کا نفسیاتی جائزہ بھی لیا ہے اور انسان کی اس صلاحیت کو بڑی اہمیت دی ہے۔ وہ کہتی ہیں ''اگر کہا جائے کہ قدرت نے انسان کو جتنی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں ان میں ارفع ترین صلاحیت تخلیقیت ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔ تخلیقیت انسانی نفسیات میں مضمرہ قوت ہے جو ایک طرف تو سماجی ''تہذیبی'' اور تمدنی ارتقا کی ضامن ہے، اور دوسری طرف فرد کی نموئے ذات، آگاہی ذات، اظہارِ ذات اور اثباتِ ذات کا اعلیٰ ترین ذریعہ ہے، جو تاریخ کے ہر دور میں انفرادی اور سماجی ارتقاء کی ضامن رہی ہے اور زماں و مکاں کی قید سے آزاد ہے۔ تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جبکہ انسانی تخلیقی قوتوں کا اظہار علم و ادب، رقص و موسیقی، مصوری اور تعمیرات، اور سائنس کی دریافتوں میں نہ ہوا ہو۔ ماقبل تاریخ کی دریافتیں، غاروں کی مصوری، ظروف سازی اور پانچ ہزار سال قبل مسیح کی تہذیبی باقیات کا علم بھی اس کی شہادت دیتا ہے کہ انسان اپنی ارتقاء کے ہر دور میں تخلیقی قوت کا اظہار کرتا رہا ہے۔ اس کی تحریک صرف مادی ہی نہیں بلکہ ایک ذہنی اپج (Stimulus) نے بھی اسے اظہار پر اکسایا ہے جس کا تعلق اس کی ضروریاتِ زندگی سے نہیں بلکہ جمالیاتی حس (Aesthetic sense) سے ہے۔ ایک اندرونی ذہنی وجذباتی تحریک سے ہے۔''

اس میں عزت و وقار، منصب اور جاہ و حشم سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔

تخلیقیت میں نفسیاتِ عمق کے کردار کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ تحلیل نفسی اور نفسیاتِ عمق کے مطالعے سے ''یہ انکشاف ہوا ہے کہ انسان کے تخلیقی کارناموں کے پسِ منظر ذہن کی وہ قوتیں بھی کام کرتی ہیں جو شعور کے دائرے میں نہیں آتیں۔ بلکہ لاشعور کی کارکردگی کہلائی جاسکتی ہیں۔'' اس عمل میں فرائڈ کے لاشعور کے علاوہ ژونگ کے اجتماعی لاشعور کی کارفرمائی بھی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فنکار بعض اوقات اپنی تخلیقات میں ایسے ایسے انکشافات کرتے ہیں اور اس طرح کے خیالات، الفاظ اور علامات کا اظہار کر دیتے ہیں جو بقول پروفیسر صاحبہ ''ہمارے ذاتی تجربے اور علم کا حصہ نہیں ہوتے جو بوقت تخلیق ایک کوندے کی طرح لپک جاتے ہیں اور تخلیقی عمل میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تخلیق کا رخ ہی بدل دیتے ہیں، جس کی کیفیت کو تخلیق میں الہامی اور باطنی تجربہ کہا جاتا ہے۔'' تخلیقی عمل میں احساسِ جمال اور حسن شناسی (Eye for beauty) کے ضمن میں کہتی ہیں ''تخلیقی تجربے کا ایک پہلو حسن شناسی ہے۔ جو چیزیں احساس جمال کو آسودہ کرتی ہیں ان پر گہری نظر رکھنا حسن شناسی ہے۔ تخلیقی عمل میں توازن، تناسب، ہم آہنگی، نغمگی اور حسن و جمال کی پاسداری کرنا جمالیاتی احساس کا ایک پہلو ہے۔ فنی اظہار میں مضمر فنکار کا ایک وصف اس کا تخلیقی تجربہ بھی ہوتا ہے۔ جو بکھری ہوئی اشیاء غیر مربوط مظاہر اور مختلف النوع تجربات اور واقعات میں ایک گہرا رِبط پیدا کرتا ہے۔ ایک تسلسل کی تخلیق اور غیر مربوط عناصر کو ہم آہنگ اور مکمل اکائی میں تبدیل کرتا ہے۔ مثلاً غالب کا ایک شعر ہے ؎

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

یہاں غالب نے موت، زیست اور غم کے تصورات میں ربط پیدا کیا ہے۔ غم جزوِ زندگی ہے اس سے مفر صرف موت میں ہی ممکن ہے۔ دوسری طرف شمع کے رات بھر جلتے رہنے کو عمر بھر غم جھیلتے رہنے کے تجربات کا ہم معنی قرار دیا ہے اور تیسری طرف موت کے آنے اور سحر کے ہونے کو ایک حقیقت کا مفہوم دیا ہے۔ اب سوچ کر دیکھیے ایک شعر کا معجزہ! جس میں موت، حیات، غم، شمع اس کا ہر رنگ میں جلنا، سحر ہونا اور سحر ہونے تک شمع کا جلتے رہنا ان سب مظاہر کو ایک زنجیر میں پرو دیتا ہے۔ ربط و تسلسل، نظم و ضبط کے ایک سانچے میں ڈھال دیا ہے اور یہ شعر معنی و مفہوم کے ایک جہاں کی تخلیق کرتے ہوئے ایک مکمل اکائی میں ڈھل گیا ہے۔ یعنی تخلیقی تجربے کا ایک اہم بُعد۔

شہزاد احمد کے مطابق فرائڈ اپنے دوسرے دور میں سائنسدان کی بجائے فلسفی سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ دراصل فرائڈ جنس، سادیت، مساکیت اور خاندانی ایڈی پس کے نظریات کو جتنی وسعت دے سکتا تھا، دے چکا تھا۔ لہٰذا پہلی جنگ عظیم کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال مثلاً جنگی جنوں اور تشدد و تخریبی رجحانات کے سوال کا جواب دینے سے قاصر تھا، اس لیے بقول شہزاد احمد ''دوسرے دور میں فرائڈ نے جو نظامِ فکر تشکیل دیا وہ اسٹیفن ہاکنگ کی طرح جدید نظریاتی طبعیات کی طرح تھا، جسے قبول یا ردِ کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ یہ نظریات ایسے نہیں جن کی تصدیق کلینک کی سطح پر کی جاسکتی ہو۔ یہ نظریات سائنس کی عمومی سطح کو توڑ کر فلسفے کے میدان میں داخل ہوتے نظر آتے ہیں۔'' اس طرح ابتداء میں فرائڈ نے ایک پورا نظامِ فکر تشکیل دیا تھا'' اور پھر اس میں وہ وسعتیں پیدا کرتا گیا اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ اس نے اپنے بنائے ہوئے نظام کی بجائے ایک نیا نظام متعارف کروایا۔ یہ رویہ اس کے دیر تک فعال رہنے کی دلیل ہے۔ وہ اپنی موت تک خاصا فعال رہا اور زندگی کے بارے میں نئی نئی رائیں اور افکار سوچتا رہا۔ اس نے مختصر کتابوں مثلاً Totem

Taboo وغیرہ میں نہ صرف ایگو، سُپر ایگو اور ID وغیرہ کی وضاحتیں کی ہیں بلکہ مذہب، تہذیب، قوت، جنگ، مقصدِ حیات اور دوسرے کئی معاشرتی عوامل کا مطالعہ بھی کیا ہے اور ان کو سمجھنے کی بھی کوشش کی ہے جو فرد یا معاشرے میں بے اطمینانی کا باعث ہیں۔

شہزاد احمد نے بھی مذہب کی وضاحت کی ہے، مگر مذہب (دین) کے وحی کے پہلو سے صرف نظر کرتے ہوئے اسے مذہبی واردات کے تناظر میں نفسیاتی بنیادوں پر بیان کیا ہے۔ وہ مذہبی واردات کے مخالفین کے جواب میں کہتے ہیں کہ سائنس جو کسی اَن دیکھی یا انجانی بات پر ایمان لانے کی قائل نہیں، اپنی ابتداء کسی مفروضے سے ہی کرتی ہے اور خود مفروضے کو ثابت کرنا ضروری نہیں سمجھتی۔ اگر نفسیات سے پوچھا جائے کہ کیا زمین واقعی موجود ہے تو وہ اس کا جواب نہیں دے سکتی۔ وہ مذہب اور سائنس کو برابری کا درجہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے اپنے اپنے دائرہ کار ہیں لہٰذا ''مذہب کے شعبوں میں سائنس کوئی علم مہیا نہیں کرتی اور مذہب اپنے طریقہ کار سے سائنس کی حدود پھاند کر اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا۔'' یعنی سائنس اگر مذہبی معاملات میں کوئی علم مہیا نہیں کرتی تو مذہب بھی سائنسی معاملات میں دخل اندازی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ صوفی اور پیغمبر کی مذہبی واردات کی تفریق کے ضمن میں کہتے ہیں کہ ''بنیادی طور پر دونوں تجربے ایک ہی رنگ اور ایک ہی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مگر دونوں کا موازنہ کیا جائے تو پیغمبرانہ تجربہ بہت وسیع اور دور دراز تک اثر انداز ہوتا ہے۔'' اس سلسلے میں انہوں نے حضرت عبدالقدوسؒ کے قول کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''حضور نبی اکرمؐ آسمان کی انتہائی بلندیوں تک گئے اور واپس آ گئے۔ اگر میں جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔ شہزاد صاحب کے مطابق فرائڈ مذہب کو ایک واہمہ (Illusion) اور مذہبی لوگوں کو بچگانہ ذہن کا حامل سمجھتا تھا جن کا تہذیب و تمدن کے ارتقاء سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مگر اس موقف کے برعکس وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ ''خواہ ہم مذہب کو انسانی ذہن کی سب سے بڑی ترقی سمجھیں یا اسے اضداد کا مجموعہ سمجھیں، لیکن اس کے باوجود اس سے انکار ممکن نہیں اور خاص طور پر جہاں مذہب کا اثر زیادہ ہو اس کا مطلب اعلیٰ درجے کی تہذیب ہوتی ہے۔'' شہزاد احمد کے مطابق یہ بات درست ہے جہاں تہذیب نہ ہو وہاں مذہب بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

شہزاد صاحب کے مطابق ''مذہب کوئی ایسی چیز نہیں جو استدلال کے ذریعے قبول کی جا سکتی ہو۔ وہ آہستہ آہستہ ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے۔'' مگر مذہبی واردات پر نفسیات دانوں کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات مثلاً یہ کہ مذہبی واردات بعض جسمانی تبدیلیوں کے باعث بروئے کار آتی ہے۔ جیسے بھوک، کم خوراکی، کم خوابی، ورزشیں، یوگا اور نشہ آور چیزیں، یا یہ کہ مذہبی تجربات کرنے والے تمام لوگ نیوراتی (Nueratic) ہوتے ہیں اور ان کا تجربہ محض فریب نظر (Hallucination) ہوتا ہے۔ یا تحلیل نفسی کے ماہرین کا یہ اعتراض جب ہم باپ کی قوتوں کو لامحدود کر دیں تو خدا کا تصور پیدا ہو جاتا ہے جو ایک مردانہ تصویر ہے اور اس کی آواز بھی مردانہ ہے، ایسے تمام اعتراضات کا جواب انہوں نے استدلالی علم کے ذریعے ہی دیا ہے۔ مثلاً خدا کے وجود کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''مذہبی واردات کے لیے خدا کے وجود کی فلسفیانہ توجیہ سے واقف ہونا ضروری نہیں، مذہبی واردات کسی ایسے شخص کو بھی ہو سکتی ہے جو خدا کا سرے سے قائل ہی نہ ہو نطشے (Nietzche) میں ہمیں ایک ایسی ہی مثال ملتی ہے۔'' نطشے کا دعویٰ تھا کہ اس نے وجد کی حالت میں اپنی مشہور کتاب ''بقول زرتشت'' لکھی تھی۔ شہزاد صاحب کا کہنا ہے کہ مذہب کی اس وارداتی شکل میں روحانی ضروریات اور حصول علم کی خواہش کو ایک وقت میں پورا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔ ''مذہب واردات کے طور پر نفسیات اور سائنس کی حدود سے باہر رہتا ہے۔ اس کی تجلیاں کسی نام نہاد علمی طریقے سے نہیں دیکھی جا سکتیں اور نہ ہی خردمندانہ رویہ ہمیں ان واردات کے سمجھنے میں حد دے

سکتا ہے۔ چنانچہ مذہب سائنس کی ترقی کے باوجود اس کی حدود میں شامل ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ سائنس کی تشریحات کسی طرح بھی مذہبی واردات کو نہیں سمجھ سکتیں۔ اس لیے مذہبی معاملات کے سلسلے میں ہمارا رویہ مذہبی ہی رہے تو بہتر ہے۔ وگرنہ ہمیں علم تو حاصل ہو جائے گا مگر وہ ہماری روحانی زندگی کی ضروریات کو پورا نہ کر سکے گا۔

قدحِ خرد فروزے کہ فرنگ داد مارا
ہمہ آفتاب لیکن اثرِ سحر نہ دارد

محترم شہزاد احمد نے مذہب یا مذہبی واردات کو سیکولر انداز میں پیش کیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مذہب میں انسان اور خدا کا تعلق صرف پرائیویٹ سطح تک محدود رہتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی پوری زندگی لادینی (Secular) نظام میں ڈھل جاتی ہے اور اس کا تعلق اجتماعی زندگی کے معاشرتی، معاشی، سیاسی، ثقافتی، تعلیمی اور عمرانی پہلوؤں سے یکسر منقطع ہو جاتا ہے، اور انسان صرف عقائد کی تلقین اور عبادت کے رسمی طریقوں کی ترغیب کے لیے مختص ہو کر رہ جاتا ہے۔ خدا رسولؐ اور آخرت کا کوئی اثر اس معاشرے میں باقی نہیں رہتا۔ یوں بقول برہان احمد فاروقی ''ان اجتماعی شعبوں سے بے دخل ہو جانے اور عقیدے، عبادت اور علوم دینیہ کا اجتماعی زندگی کے کسی پہلو سے باقی نہ رہنے کا اثر یہ ہوا کہ عقیدہ وہم بن کر رہ گیا اور عبادات رسوم وظواہر میں تبدیل ہو گئیں۔''

محترم شہزاد صاحب نے مذہبی واردات کے سرچشمہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ علامہ قبالؒ نے بے شک مذہبی واردات پر بڑی لمبی بحث کی ہے لیکن انہوں نے وجدان کو انسانی فکر کا ہی ایک پہلو قرار دیا ہے، اس کو کسی باطنی علم سے منسلک نہیں کیا۔ وہ اپنے پہلے خطبے میں کہتے ہیں ''پھر اس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ فکر اور وجدان بالطبع ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دونوں کا سرچشمہ ایک ہے اور دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کا سبب بنتے ہیں۔'' وجدان کا بڑا فوئید برگساں بھی اسے ایک بلند نوعِ فکر (A higher king of intellect) قرار دیتا ہے۔ اسی طرح انبیاءؑ اور صوفیاؒ یا نبوت اور تصوّف کے خصائص وکوائف میں بنیادی فرق ہے۔ باطنیت ایک اکتسابی فن ہے جو مختلف قوائد وضوابط کے ماتحت ریاضتوں اور مشقتوں سے حاصل ہوتا ہے جبکہ نبوّت ایک وہبی شے ہے جس میں حقیقت خود اپنے آپ کو منکشف کرتی ہے۔ لہٰذا علم نبوّت اور کشف وجدان میں صرف درجہ (Degree) کا فرق نہیں بلکہ کیفیت، (Aualitative) کا فرق ہے۔ وحی سراسر معروضی ہے اور وجدان وغیرہ کی نوعیت یکسر موضوعی ہے۔

انسانی ذات کے بارے میں ژونگ کے خیالات آپکی نظر سے گذر چکے ہیں۔ آخر میں ذات کے بارے میں محترمہ ساجدہ زیدی کے نظریات پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔ وہ کہتی ہیں۔ ''اب ہم شخصیت کے ایسے پہلو کی طرف رجوع کریں گے جو انسانی شخصیت کا محور یا مرکز ہے جس طرح زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے، اسی طرح شخصیت اپنی تمام نیرنگیوں کے ساتھ ذات کے گرد گھومتی ہے۔ جس طرح زمین کا محور کوئی مقام نہیں کوئی مادی یا جسمانی ساخت نہیں، یعہ اسی طرح انسانی ذات ہے کہ اس کو کسی شکل میں (Form) شے کی طرح سمجھا نہیں جا سکتا۔ وہ ایک ایسا خیالی مرکز ہے جو شخصیت کی حرکیت اور فعالیت کا ضامن ہے۔ جو نظر نہیں آتی مگر ہے۔ جس پر شخصیت کے تمام پہلوؤں کے رنگ وآہنگ اور اس کی مخصوص نوعیت کا دارومدار ہے۔ ذات انسانی، انسان کے تمام وجود کا محور ومرکز ہی نہیں بلکہ اس کے تمام وجود کا حوالہ (Point of Reference) ہے۔

پاکستان میں
غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ

نوٹ: نمائندگان محترم سے التماس ہے کہ ایڈریس، فون نمبر، ای میل یا اوقاتِ درس میں تبدیلی کی صورت میں ادارہ کو فی الفور مطلع فرمائیں۔

شہر	مقام	دن	وقت
ایبٹ آباد	234-KL کیہال۔ رابطہ احمد نواز خان۔ فون: 0992-334699۔ موبائل: 0314-5035285	بروز جمعہ	3PM
اسلام آباد	مکان نمبر 302۔ اسٹریٹ نمبر 57۔ سیکٹر F-11/4۔ رابطہ ڈاکٹر انعام الحق۔ فون: 051-8357302 Email: dr.inam57@gmail.com		
اوکاڑہ	بر مکان احمد علی، بیت الحمد، 180-AB-4، ابوبکر بلاک شادمان کالونی، ایم۔ اے جناح روڈ، نزد مبارک مسجد رابطہ میاں احمد علی: 0442-527325، موبائل: 0321-7082673	بروز جمعہ	3PM
بونیر	حجرہ حفیظ الرحمٰن۔ کس کورونہ۔ طوطالئی۔ ضلع بونیر۔ رابطہ قاسم خان: 0314-9911900 رابطہ حفیظ الرحمٰن: 0314-9508409 - 0313-9471294 Email: hafeez_patriot@hotmail.com	ہر ماہ پہلا اتوار	صبح 9 بجے
پنج کسی	بر مطب حکیم احمد دین۔ رابطہ ڈاکٹر محمد سلیم قمر۔ تحصیل کبیر والا ضلع خانیوال فون نمبر: 0345-7385320 Email: muhammad_saleem450@yahoo.com	بروز جمعہ	3PM
پنڈ دادن خان	رابطہ محمد نذیر۔ بمقام وڈاک خانہ روال نزد غریب وال سیمنٹ فیکٹری، تحصیل پنڈ دادن خان ضلع جہلم فون نمبر: 0346-6450130 Email: nazeernaz@hotmail.com	بروز بدھ	بعد نماز عشاء
چوٹی زیریں	بر دوکان لغاری برادرز، زرعی سروس، ڈیرہ غازی خان۔ رابطہ: ارشاد احمد لغاری۔ موبائل: 0331-8601520	ہر ماہ پہلا اتوار	12 بجے دن
چنیوٹ	11/9-W، گوجر چوک (گنبد والی کوٹھی) سیٹلائیٹ ٹاؤن۔ رابطہ: چوہدری دلمیر خان، فون: 047-6331440، موبائل نمبر: 0321-7704564	بروز جمعہ	بعد نماز جمعہ
حیدر آباد (قاسم آباد)	محترم ایاز حسین انصاری، B-12، حیدر آباد ٹاؤن، فیز نمبر 2، قاسم آباد بالمقابل نسیم نگر آخری بس سٹاپ۔ رابطہ موبائل: 0336-3080355		
راولپنڈی	فرسٹ فلور، کمرہ نمبر 114، فیضان پلازہ۔ کمیٹی چوک۔ رابطہ ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ، موبائل: 0331-5035964 Email: abidhussain3012@hotmail.com	بروز اتوار	صبح 9:30 بجے
راولپنڈی	بر مکان امجد محمود، مکان نمبر 14/A، گلی نمبر 4، راہِ طلوع اسلام، جنجوعہ ٹاؤن، اڈیالہ روڈ، نزد جراحی سٹاپ، راولپنڈی۔ رابطہ: رہائش: 051-5573299، موبائل: 0322-5081985	بروز اتوار	10AM
سرگودھا	B-4، گلی نمبر 7، بلاک 21، نزد مکی مسجد چاندنی چوک، رابطہ۔ ملک محمد اقبال۔ فون: 048-3711233 0306-6730342	بروز جمعہ	بعد نماز جمعہ

سیالکوٹ	معرفت کمپیوٹرسٹی، سٹی ہاؤس، سٹی سٹریٹ، شہاب پورہ روڈ، رابطہ: محمد حنیف، 03007158446۔ محمد طاہر بٹ، 0300-8611410۔ محمد آصف مغل 0333-8616286۔ سٹی ہاؤس 052-3256700	ہر دوسرے اتوار	5PM
فیصل آباد	رحمان نور سینٹر، فرسٹ فلور، مین ڈگلس پورہ بازار، رابطہ: محمد عقیل حیدر، موبائل: 0313-7645065 Email: bazamfaisalabad@gmail.com	بروز جمعہ	4PM
gpec Z™	XwDZ* zgêgyzg ‡ Ô ã ¼ zgÃA-446 فون: 021-35892083، موبائل: 0300-2275702 Email: bazmkhi@hotmail.com	بروز اتوار	10AM
S&Nc Z™	ڈبل اسٹوری نمبر 16، گلشن مارکیٹ، کورنگی نمبر 5، ایریا 36/C، پوسٹ کوڈ 74900 رابطہ: محمد سرور۔ فون نمبرز: 021-35031379-35046409، موبائل: 0321-2272149	بروز اتوار	2PM
; Uc Z™	نالج اینڈ ویزڈم سنٹر، سلمان ٹاورز، آفس نمبر A-45، بالمقابل نادرا آفس، ملیر سٹی۔ رابطہ: آصف جلیل فون: 021-35421511، موبائل: 0333-2121992، محمود الحسن۔ فون: 021-34179307 Email: asif.jalil1@gmail.com	بروز اتوار	11AM
لاہور	B-25، گلبرگ 2، (نزد مین مارکیٹ، مسجد روڈ)۔ رابطہ فون نمبر: 042-35714546 Email: idarati@gmail.com	بروز اتوار	9:30AM
لاڑکانہ	مکان نمبر 1582 پرانا عیدگاہ روڈ نزد قاسمیہ مسجد محلّہ جاڑل شاہ، رابطہ سکندر علی عباسی، فون: 074-4042714، اللہ بخش شیخ، موبائل: 0333-7542644	بروز جمعہ	بعد نماز مغرب
منڈی۔۔ بہاؤالدین	رابطہ: خان محمد، (وڈیو کیسٹ) بر مکان ماسٹر خان محمد گلی نمبر 1، محلّہ صوفی پورہ۔ فون نمبر: 0456-520969 موبائل نمبر: 0334-4907242	بروز جمعہ	10 AM
نواں کلی، صوابی	اسرار اللہ c/o جوہر علی شاہ۔ محلّہ خود خیل کرنل شیر کلی۔ تحصیل رزڑ۔ ضلع صوابی فون: 0336-9770807, 0301-8344296 Email: israrullah901@gmail.com	بروز اتوار	10 AM
صوابی	گاؤں وڈاکخانہ چارباغ تحصیل وضلع صوابی رابطہ: عمر فاروق موبائل: 0343-8981935		
ملتان	بر مکان مظہر حیات۔ نزد مین گیٹ خواجہ فرید سوشل سیکورٹی ہسپتال وہاڑی روڈ۔ ملتان۔ رابطہ شان الٰہی مظہر، موبائل: 0300-4469722	ہر اتوار	سہ پہر 3 بجے
مینگورہ۔ سوات	رابطہ۔ خورشید انور معرفت طارق آٹو پکو۔ خالد پلازہ حاجی شمس الحق۔ نشاط چوک۔ مینگورہ ضلع سوات فون: 0315-9317755 Email: khurshaidanwar@yahoo.com	ہر ماہ پہلے جمعہ کو	2PM
علی گرام۔ سوات	علی گرام۔ تحصیل کبل ضلع سوات۔ رابطہ محمد ظاہر شاہ خان۔ فون: 0346-9467559 0341-4342200 :y ¯Xy{x {v	ہر اتوار	8:30AM
فتح پور۔ سوات	فتح پور، سوات، رابطہ: خورشید انور، فون: 0946-840800 موبائل: 0315-9317755 امیر زیب خان۔ موبائل: 0344-9893235	ہر اتوار	3PM

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 10 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دوقومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربوٰ (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہوذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی وملائی وپیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مردمومن	مقام محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یکے از مطبوعات باغبان ایسوسی ایشن

☆ باغبان ایسوسی ایشن کا ماٹو ''قرآن فہمی اور باغبانی'' ہے۔

☆ باغبانوں کے غیر رسمی اجتماعات ہر ماہ 15-30 تاریخ کو ہوتے ہیں جن میں وہ اپنے تجربات ومشاہدات سے باغبانی کو ارتقاء کا رنگ دیتے ہیں۔

نوجوانوں کے نام

عزیز نوجوانو! میں نے ایک علم دوست جوان واجد حسین شاہ صاحب کو سیاسی اور فرقہ کی لائن سے بلند ہو کر انسانیت کی خدمت کرتے دیکھا ہے۔ آج پاکستان کو جو مشکل صورت حال درپیش ہے اس میں امن۔ ربوبیت۔ احترام۔ تعاون اور آفاقی دور اندیشی کی ضرورت ہے میں پاکستان کے نوجوانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ سیاسی اور فرقے کی لائن سے بلند ہو کر انسانیت کی خدمت میں اپنا کردار ادا کریں۔

باغبان ایسوسی ایشن آپ کو ایسا ہی پلیٹ فارم مہیا کرتی ہے۔ جہاں آپ قرآنی آفاقیت کے ساتھ ساتھ باغبانی کے تجربات بھی کر سکیں گے۔ باغبانی جہاں ماحولیات کے لئے اہم ہے وہاں ذرائع روزگار بھی مہیا کرتی ہے۔ پھلوں کی کثرت غذائیت کا شہکار بن جاتی ہے۔ سبز انقلاب کی تکمیل سے ہم بہت سے مسائل حل کرنے کے قابل ہو جائیں گے بنجر پاکستان آباد ہوگا۔

پتہ رابطہ: ملک حنیف وجدانی صدر باغبان ایسوسی ایشن سنبل سیّداں نیومری۔ پاکستان
موبائل نمبر: 0310-1547355

Surah *Al-Naziat*(النّٰزِعٰتِ) –Durus-al-Qur'an Parah 30: Chapter 6

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

My dear friends, today is June 22, 1984 and today's lecture starts with verse 27 of Surah *Al-Naziat* (النّٰزِعٰتِ).

Summary of the last lecture

In order to provide proof of its claims, the Quran presents evidence from two sources: i) history and ii) the external Universe. The last lecture provided historical evidenceof the confrontation between Pharaoh and Musa (PBUH). Pharaoh claimed ownership of land and rivers of Egypt by declaring himself – فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) – "I am your Lord All-Highest!" [Asad] رَبُّكُمْ (*Rabbukum*) means he was claiming to be the provider and sustainer of all his people وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ (43:51) – And Pharaoh issued a call to his people, saying: "O my people! Does not the dominion over Egypt belong to me, since all these running waters flow at my feet?" Here, he was directly asking his people: Tell me who is owner of all the lands and all the waters for irrigation, the rivers and canals? Tell me! Are all these not mine? Am I not the sole owner? If I stop this sustenance from you just for a day, then you will know what I mean? Now tell me is this not true? The Quran then presents evidence from the external universe to refute Pharaoh's claim.

The verse 27 – although it talks about the workings of the law of nature pertaining to the external universe – *is* related to providing sustenance and nourishment. It tells Pharaoh: You have acquired the land and rivers by force so how could you become their owner? These were there even before your ancestors were born? But who created them in the first place? You are saying that these rivers are yours but did you create their water? From where did the water come? Who produced the water? The one who created this earth; the one who created the water; the one who created the mountains; the one who created the nature's entire waterworks system – He must be the owner of all these. Remember! The one who creates is the sole legitimate authority who could claim ownership. How could you claim

ownership? Here, these two proofs are presented – workings of the law of nature and refutation of Pharaoh's claim of ownership of land and rivers – in the context of overall workings of the external Universe.

The Quran says ءَاَنتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ۔ رَفَعَ سَمۡكَهَا فَسَوّٰىهَا ۔ وَاَغۡطَشَ لَيۡلَهَا وَاَخۡرَجَ ضُحٰىهَا (79:27-29) – [O mankind!] Are you more difficult to create than the heaven which He has built? High has He reared its vault and formed it in accordance with what it was meant to be; and He has made dark its night and brought forth its light of day.[Asad].The Quran challenges human beings here to ponder on the reality of this limitless Universe and to compare its creation with that of human beings – and then it asks human beings to think about which creation is more complex and difficult: the Universe or the human beings? Is not the entire Universe and all the heavenly objects in it are working in perfect balance and unison and harmony? The more we ponder and discover realities behind the Universe the more amazing it seems to be. Integrated into this cosmos are humans for whom Allah created darkness of night and brightness of day. Why the darkness and brightness are specifically mentioned would soon become clear.

The Universe and the nature of its objects

My dear friends! Just think about this mindboggling creation. There are billions of galaxies and trillions of stars and planets that comprise the space time of this limitless Universe – called السَّمَآءُ (*As-Samaah*) by the Quran. Although our earth is large but it is no more than a tiny speck, a hardly noticeable dot compared to the size of the cosmos. Even our own solar system comprising the sun and the eight planets that orbit it is itself extremely small compared to other stars– so much so that scientists, even in this modern age, do not have any clue as to the size and scope of our Universe. So, the Quran asks: Think about it: Is this Universe your creation? And further, ponder on its workings? Notice how beautifully everything works in it?– Every object is constantly in motion and is working ceaselessly in harmony and balance with every other object within this gigantic Universe – فَسَوّٰىهَا (79:28).

My dear friends! Just look at the Earth: Although it is round but how well it is suited for dwelling that we don't even realize that it is round. If one starts

traveling then one may think that somewhere one will see its roundness and one may fall suddenly just as it happens to anyone walking on a round object. But it never happens on Earth. Until it was discovered scientifically that it was round, it was thought of being flat. Even today if we did not have this scientific discovery we would think the same; that the Earth is flat because it seems flat. This is worth pondering. We now know – and this "now" is very recent like a blink of an eye compared to the age of the Earth– that this is a strange creation: A round object, travelling at high speed not only on its own axis but moving at high speed in its orbit – and here we are living on it comfortably without even feeling anything. This is why the Quran said: وَالْاَرْضَ سَنَّهٰهَا فَسَوّٰهَا (79:28).

My dear friends! The meaning of سَوّٰهَا is to create balance and stability. The Earth is moving so fast carrying everything on it including humans but it remains balanced and stable at the same time; and there is a continuous alternation of opposites – of darkness and light – about which the Quran says at another place (17:12): After working for all day whatever energy is consumed in the process it is returned back in the morning after sleeping in the darkness of the night; and one is ready and refreshed to start work in the brightness of the next day. The alternation of night and day (i.e., darkness and light) is embedded into the same system that binds all the objects of the cosmos together. The next verse (79:30) and especially the word طَحٰهَا (*Dahahaa*) requires some special attention as it sheds light on the relationship between the Quran and science.

The nature of relationship between the Quran and science

My dear friends! Every word of the Quran is a miracle and its every word is a revelation of Allah. So, we cannot attach more importance to one word or one term of the Quran compared to another. But some realities that Quran describes spring up suddenly and announce: Here is Miracle!? But how can we recognize those realities? Well, it requires knowledge. Only the scientists of the West can appreciate and ponder on these realities and reach the conclusion – that the Quran cannot be the word of a human being. On the contrary, here we are, who do not even try to ponder on the world of science. How then can we understand the Quran; how then can we appreciate its miracles? Actually, as far as we are concerned, we only see contradictions in the Quran. But these scientists are not

Muslims; they do not believe in the Quran. However, they independently ponder on the Quran and conduct research on the realities described therein; and then they invite their colleagues to ponder on this fact: how could anyone 1400 years ago have said these things; how any human mind could have comprehended these scientific realities 1400 years ago? So, the conclusion? – There is no other choice but to accept that this Quran is from a supra-human source; that this is not the creation of a human being. The verse that is in front of me will explain why these scientists come to this conclusion. That verse is: وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا (79:30) – And after that, the earth: wide has He spread its expanse. [Asad].

How did these planets and stars come into existence? How are they moving so fast? We cannot comprehend it? I am talking about it in general terms. What about our past and present interpreters? What and how did they understand this? There is this one word دَحٰهَا of the Quran which sheds light on this for our understanding. As to how this cosmos came into existence – there are some other verses that shed light on this point.

How did the Universe come into existence?

My dear friends! You should remember that our translators and interpreters did not do a proper job because they could not see the facts mentioned in the verses related to this topic. How did the Universe come into existence? The Quran says that the whole Universe started initially in the form of a gaseous state which it calls دخان(*Dukhaan*).Then the Quran says اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (21:30) – Are, then, they who are bent on denying the truth not aware that the heavens and the earth were (once) one single entity, which We then parted asunder?[Asad].

My dear friends! Let us ponder on the three words of the Quran: فَفَتَقْنٰهُمَا (21:30) and دَحٰهَا (79:30). You have seen a sling or catapult with which children play. Gardeners also use it to drive away birds. It was a great weapon in ancient wars. The stone in catapult is given a circular motion and then released suddenly at high speed. The stone would travel in the air and also spin at the same time. The Quran states that this gaseous mass was spinning at an extremely high

speed: اَنَّا فَفَتَقْنٰهُمَا (21:30) – رَتْق means collected together and فَتَق means spinning motion of some liquid from which droplets sprinkle out. The Quran says the Universe was initially a gaseous nebula spinning at high speed and from its sprinkles became galaxies, stars, and planets.

Please forgive me if the topic I am presenting and what the scientists have discovered recently is somewhat dry. But these are the words of Arabic language and have been selected by none other than Allah. We note here how modern science has lifted the veil from the face of reality which the Quran described 1400 years by the words رَتْق and فَتَق and which exactly describe what happened just after the Universe came into existence and how the galaxies and stars and planets were formed from the sprinkles that were thrown away by the spinning and expanding gaseous state of the nebulae. We also know now that our solar system is moving towards a destination which 1400 years ago the Quran had described as: وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (36:40) – And the sun: it runs in an orbit of its own that is laid down by the will of the Almighty, the All-Knowing. [Asad]. This is what the modern science has discovered now. And the Quran also said: وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (21:33) – And He it is Who created the night and the day, and the sun and the moon. They float, each in an orbit.[Pickthall].

The word تَقْدِیر(*Taqdeer*) has come in verse (36:40). What a word تَقْدِیر is! – It means a measure and standard or law. The verse says that the entire solar system is moving towards مُسْتَقَر(*Mustaqar*). Only recently scientists have discovered this مُسْتَقَر (*Mustaqar*) and have termed it as solar apex. The Quran also tells: وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ (36:39) – and the moon, for which We have determined phases. [Asad]. These are some of the verses of the Quran and as I mentioned we did not have any concept of the movements of stars and planets and galaxies through space time until recently. The Quran mentions that when the cover will be lifted from the realities and laws of the Universe and when human knowledge gradually advances then each discovery and each revealed fact will become a witness and a proof in support of the Quranic claim.

Reason for our failure

My dear friends! Please keep in mind that these discoveries had not happened during the time of our ancestors. Human knowledge had not advanced far enough during their time. It is alright that whatever knowledge they had at their time they wrote in their books. This is not something that we should condemn them about. What is our greatness if the knowledge has advanced so much more now? Maybe future generations will think of us the same way we are thinking about our past scholars now. Who knows how many covers human knowledge will lift from the face of reality in future? If our present scholars said: it is okay to revise our old books if we found something in them that modern science has revealed to be false. But our scholars do not accept this. This is the real problem.

The conspiracy that happened with us is that whatever our scholars wrote they attributed it to the Prophet (PBUH). They claimed that the Prophet (PBUH) said this. When it is mentioned that the Prophet (PBUH) said something then who can dare to say that this is not right? Now, if it was the case that when a reality was dis-covered that proved conclusively that what had been mentioned in our books could not have been from the Prophet (PBUH); that it must have been fabricated and wrongly attributed to the Prophet (PBUH) – then there is a room for disagreement and correction. But if it is told that there is no such room; that what has been reported *is* from the Prophet (PBUH) no matter the evidence against it, no matter the facts and observations against it. And if anyone who questions the status quo based on facts and evidence then it is declared that he is a denier of hadith; that he is a denier of the Sunnah of the Prophet (PBUH) – and thus he is an infideland is worthy of being expelled from Islam.

Now, this statement: *"that Earth is stationery"* is against observation; it is against reality and knowledge. But – May Allah protect! – What kind of Prophet (PBUH) are we presenting to the world if we keep insisting that this is *his* saying? But the chancellor of Medina University even today proclaims that anyone who says that the earth is moving is no longer a Muslim; that he has become a *Murtad* – a deviator. Why is the good chancellor saying that? Because the statement that the earth is stationery is a hadith of the Prophet (PBUH) and if a person does not accept it to be true then he is belying this hadith. Did you notice that this has

closed the door for future knowledge and thought? There is no room in this for research and discovery. Therefore, as far as Muslims are concerned, human knowledge got frozen in time. Well, we can satisfy ourselves because of the belief that the Prophet (PBUH) said this but what will we say to the world? Further, based on these attributed sayings of the Prophet (PBUH) were compiled the books of *Tafsir* (interpretation of the Quran). Thus because of the human knowledge that was at the time and because whatever the books of hadith say – we are mentally stuck and imprisoned in them ever since. This is what happened to us!

The research of Dr. Maurice Bucaille on the Quran

My dear friends! I said that I will present to you research of some scientists of Europeon the Quran. If you remember I had mentioned the name of Dr. Maurice Bucaille in several of my lectures and I also published a detailed critique of his book "The Bible, The Quran and Science" in the Tolu-e-Islam magazine. He is a Christian.

Dr. Maurice Bucaille investigated the Bible's stories about the Universe and its creation and found them to be against realities and facts. He got quite disappointed with religion after that. However, he mentioned that although Bible is the book of both Christianity and Judaism but there is another religious book, the Quran, of a very large population in the world. So, he decided to look into it. It is his (and ours) good fortune that he came to the Quran first and then to the narrations and hadith. Now, please note his style of research. As it is, translations of the Quran were available to him. Since he did not know Arabic, he tried to understand the Quran through the translations. But he found that whatever the Bible says that is what mostly the translations of the Quran say. This is not surprising as our translations and interpretations of the Quran are done through the narrations and hadiths which are full of stories form Bible and Torah. We will shortly see howa true research scholar like Dr. Maurice Bucaille then proceeds further on his research mission?

If you remember I keep emphasizing how I myself found out the process of understanding the Quran. The Quran itself has made it clear that one should determine its meaning from the Arabic language of the time when it was being revealed. In these intervening 1400 years Arabic language has changed so much

that modern Arabic bears little resemblance to the Arabic of the time of the Prophet (PBUH). So, one must first determine the meaning of the Quranic words that was understood at the time of the Prophet (PBUH). In my journey of understanding the Quran that is where I started from. And this was a departure from the traditional way of understanding of the Quran. Because of this I was declared a *Murtad* (Deviator); and a fatwa declaring me an unbeliever was rendered against me. Many others things were also alleged against me. But the point to note is what meanings of the Quran did the Arabs of the time of the Prophet (PBUH) used to take? However, one thing is sure. Those Arabs never asked the Prophet (PBUH) meaning of any Arabic word of the Quran. They never asked him to clarify the meaning of an Arabic word that appeared in the Quran. They never asked the Prophet (PBUH) to bring a lexical authority for any word of the Quran because of their lack of understanding of its meaning. It *was* their language and they *understood* the meaning of its words. This is the first thing to note. I spent almost all my entire life compiling my *Lughat-ul-Quran* based on the meaning that the Arabs of the time of the Prophet (PBUH) used to take of the Quranic words. The second thing the Quran itself has suggested for clarifying its meaning is to use cross reference and concordance. That is, by collecting all the verses together on a particular topic clarifies the meaning and one does not need any external source in the process of understanding the Quran. This is the miracle of the Quran. I also compiled a topic-wise concordance of the Quran called *Tabweeb-ul-Quran*. These are the two things worth noting if one wants to understand the Quran. This is the way I have understood the Quran and have been explaining it ever since, for more than fifty years. This was my duty and responsibility to do because of my *Iman* (conviction). But this was not the case with Dr. Maurice Bucaille. His was purely an intellectual and research-based effort. According to him, saying that one has understood the Quran through the translations – is wrong. One has really understood what the translator had understood. If that is the case, then it is not research and this is not the way to understand the Quran. Healso said that one cannot understand the Quran through the modern Arabic language; that for understanding the Quran it is necessary for one to understand the Arabic language of the time of the Prophet (PBUH).

Difficulty in understanding the Quran through modern Arabic

My dear friends! Maurice Bucaille says that to understand a book one has to know the language of the period in which that book was written. So, he went to Arabia to live and to learn the old Arabic language which was preserved among the Bedouins living in the deserts. This is what is called research, my friends. After learning the language this way he finally understood what the Quran really says about the Universe and Nature! He went on to collect and to classify the verses of the Quran on topics related to the Universe and its creation; and he determined the meanings of the words from the Arabic he had learned from the Bedouins. After he did that he was amazed and surprised how these meanings were in complete accordance with modern scientific data. In utter amazement and ecstasy he called on the thinkers and the scientists of the world – for God's sake please tell me know how a human could say such things 1400 years ago!? I will now present to you Dr. Bucaille' sresearch regarding the Quranic verse (21:30).

The significance of Quranic realitiesto Dr. Maurice Bucaille

My dear friends! I have the book of Dr. Bucaille here in front of me. He wrote this nook in French. He translated this book in Arabic himself, and with Alastair D. Pannell into English. He took this verse رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا (21:30) and many other related verses and discussed them in great depth in his book. He discussed about the Bible first. Please forgive me but since this lecture is being recorded I want to quote his exact words:

> Whereas monumental errors are to be found in the Bible, I could not find a single error in the Quran. I had to stop and ask myself: if a man was the author of the Quran, how could he have written facts in the Seventh century A.D. that today are shown to be in keeping with modern scientific knowledge? There was absolutely no doubt about it: the text of the Quran we have today is most definitely a text of the period, if I may be allowed to put it in these terms (in the next chapter of the present section of the book I shall be dealing with this problem). What human explanation can there be for this observation? In my opinion there is no explanation; there is no special reason why an inhabitant of the Arabian Peninsula should, at a time when King Dagobert was reigning in France (629-639 A.D.), have had scientific knowledge on certain subjects that was ten centuries ahead of our own.

Then he goes on:

> How could a man, from being illiterate, become the most important author, in terms of literary merit, in the whole of Arabic literature? How could he then pronounce truths of a scientific nature that no other human being could possibly have developed at the time, and all this without once making the slightest error in his pronouncements on the subject? The ideas in this study are developed from a purely scientific point of view. They lead to the conclusion that it is inconceivable for a human being living in the Seventh century A.D. to have made statements in the Quran on a great variety of subjects that do not belong to his period and for them to be in keeping with what was to be known only centuries later. For me, there can be no human explanation to the Quran.

Finally, he feels very surprised at the modern Muslim scholars who do not use modern scientific discoveriesto clarify the meaning of the verses dealing with Nature:

> Why do such errors in translation exist? They may be explained by the fact that modern translators often take up, rather uncritically, the interpretations given by older commentators. In their day, the latter had an excuse for having given an inappropriate definition to an Arabic word containing several possible meanings; they could not possibly have understood the real sense of the word or phrase which has only become clear in the present day thanks to scientific knowledge. In other words, the problem is raised of the necessary revision of translations and commentaries. It was not possible to do this at a certain period in the past, but nowadays we have knowledge that enables us to render their true sense. These problems of translation are not present for the texts of the Judeo-Christian Revelation: the case described here is absolutely unique to the Quran.

It is impossible to understand the Quran without independent knowledge and research

My dear friends! This non-Muslim researcher reached this conclusion about the Quranic realities after thorough independent research. This is such a huge evidence for the claim that the Quran is a book and a revelation from Allah – that stands out 100% true on the touchstone of research and knowledge. But how unfortunate that despite this clear evidence, it is the Muslim nation that is standing in its way! Please forgive me if "I" come into the picture sometimes. Please note that no Western researcher like this original researcher of the Quran Dr. Maurice Bucaille was there when I started my journey of understanding and of explaining

the Quran more than 50 years ago. No one had presented this method of understanding of the Quran then. He is the first person who presented such an argument. Otherwise, all the orientalist and Western researchers have used only our traditional translations and interpretations for their research instead of the Quran. They never focused their attention directly on the Quran. But all what I have done on the Quranic understanding and explanation – all this I did during the same period. Modern researchers and scientists have corroborated my approach to understanding of the Quran. And Dr. Maurice Bucaille, after using this approach of understanding the Quran, selected verses of the Quran that are related to the creation of the Universe for his focus of studies and came to the conclusion described above that the Quran cannot be the work of any human; that it must be from God; that it is revelation from God and not the product of human thought. How remarkable!

Comparison of hadith and Bible

My dear friends! Dr. Maurice goes further. He says that despite having this gift of guiding light Muslims are treading in darkness. The last chapter of his book is *The Qur'an, Hadiths and Modern Science*. He has given in this chapter some hadiths and says that these have drowned the Muslim ship. May Allah protect us! – It is not that these hadiths are the sayings of the Prophet (PBUH) but that they have been wrongly attributed to him. He also has given statements from Bible – and then he says that both hadith and Bible are similar in nature. The sources of both are the same. Narrators of Bible came up with narrations and made them part of the Bible. Hadith narrators could not insert their narrations into the Quran because Allah has taken the responsibility to protect the Quran. But they made these narrations as if it were another "Quran". These attributed sayings are present in both the bible and the hadith.

Dr. Maurice Bucaille compared the Bible and the Quran in the first two parts of his book under the title *Qur'anic and Biblical Narrations*. He mentions that it seems Bible is the product human mind of the time when it was compiled. There are many errors in Bible – errors that contradict science; errors that are against facts and realities; and errors that are wildly immoral. In contrast to this, the Quran is error free and it successfully stands out 100% on the touchstone of knowledge and scientific discovery. Then Dr. Bucaille says: it is understandable that Bible writers could not claim that these are the exact words of revelation that

Jesus received from God. But he wonders what happened to these Muslims? He draws a parallel between Bible and Hadith and says that they are at the same level – the level of religion. But this is not *Deen*. A non-Muslim thinker reaches this conclusion! How amazing!!

Muslim bloodin the streets of Baghdad

My dear friends! Whatever I am saying about the Quran and the way to understand it – may not seem to you useful because what were small pebbles in its way before, have turned into mountains in our period. Once, in our history, an effort *was* made to understand the Quran through knowledge and intellect but what did our traditional religious establishment do then? – Well, the evidence of it is provided by the blood of those writers that flowed in the streets of Baghdad. Not a single page could be found of the books they had written on the Quranic realties based on knowledge and considerable research. Sometimes in the books written by our traditional religious scholars we find abuse and insinuations hurled against them but we cannot find even a single page of their books. They eliminated any such trace thousand years ago so ruthlessly that no effort was made to resurrect this intellectual effort after that. If an effort was made then it must have been at the individual level. But nothing would have come out of it anyway because it would have been suppressed or destroyed as nothing is known now. Such are the roadblocks in the way of the Quran. It was monumental then – and it is the same thing now.

The biggest roadblock in the way of the Quran – and its consequence

My dear friends! Please let me tell you about what all I have done on the Quran – not that I want to boast but because I want to pay my thanks to Allah. I do not get any revelation or inspiration from above. Whatever effort I spent and whatever I have been able to accomplish – I have only followed the way the Quran itself has mentioned for its understanding and comprehension. Was it not for the religious establishment putting roadblocks in its way, a Quranic government would have been established in Pakistan; and the world would have seen its positive results. This is the conclusion Dr. Bucaille has reached after his research on the Quran, and which has attracted world-wide attention of intellectuals and thinkers. If Pakistan was fortunate enough to establish a Quranic government then don't ask what heights it won't have been able to reach. But efforts were especially made to make sure to drown the voice of the Quran by massive propaganda and slogans

against me: that I am a denier of hadith; that I am a denier of the Sunnah; that I am misguided and deviated (*Muratad*). Well! Nothing bad can happen to me from this massive propaganda against me, my friends. I don't have a business that could be adversely affected by these slogans against me. But it does sadden me however in my late period of life to see that whatever I have been able to accomplish on the Quran with great effort within my limited capacity and meagre resources –even this small literature that I have been able to produce– if it was made available to the general public and was made commonplace, then the condition of the Pakistani society would have been different; and the world would have seen what the Quran really is! It is unfortunate for me as well as for this nation – and for the world too – that traditional religious establishment does not allow this pure message of the Quran to take hold among the public because if it does then nothing remains of there ligious establishment's business warehouse – resulting in its entire edifice to collapse. You know that students of our religion spend 9-10 years in religious schools (or *Darul-Ulum*) and study many subjects (more than 18 different fields) but in their curriculum the Quran is not one of them. After going through this program one gets the certificate of scholar and expert (*Aalim* and *Fadil*) but his scholarship or expertise is of no use in practice since the Quran is absent from their education. If we say that *Deen* can only be understood and implemented through the Quran then these so-called scholars cannot offer anything for it because the Quran was never part of their instruction and curriculum – thus rendering their entire profession useless for the establishment of *Deen*. But their number is in hundreds of millions and they do not have any other means of livelihood except their profession – and they now have power and authority along with economic power. So, who wants to give up this lucrative business and authority in favor of the Quran which takes away all these from them.

The fat was of religious priesthood became laws

My dear friends! Before, their religious decisions were called fat was which one could accept or reject. But these fat was have become state laws now.Thus there is no question that one can avoid them. Anyway, this is a separate topic and I am not going to go into this because it involves sectarianism. What were called personal laws before have now become state laws! This was the case during the period of kingships. The British implemented these personal laws as state laws for Muslims

of India and termed them Mohammedan Laws. Because of this Muslims have been trapped in real dilemmas. For example, if the husband simply says "*Talaq*" (Divorce) three times in anger then his wife gets divorced. And after that the ritual of *Halaalaa*is required if the husband wants his wife back? May Allah protect – my daughters are sitting here and I am embarrassed even to mention it; but the fact is that it has become the law. Another example: a grandson cannot get any inheritance from his grandfather – sadly enough because the grandson became an orphan! Or, one cannot make a will of one's full wealth even if he knows his family will suffer at the hands of relatives who will loot his leftover wealth because these fat was have become state laws.

My dear friends! If we had understood the Quran the way this researcher, Dr. Maurice Bucaille, has understood; and then if we had spread its light, then, even in this period, this country would have become a glittering example to the world. At least there would have been one place in this world where its glittering rays would have travelled to far off places. I took just one verse today about the creation of the Universe. But Dr. Bucaille has taken many verses related to the creation of the Universe and has done penetrating research about them. My dear friends, we completed until the verse: وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا (79:30). It was extremely necessary to have in-depth discussion about دَحَاهَا (79:30) and فَفَتَقْنَاهُمَا (21:30). We usually read the traditional translations and move on. But people like Dr. Bucaille stop and think about these verses and then understand them by carrying out independent penetrating research with deep knowledge. *This* is the way to understand the Quran.

My dear friends! Time is over for today's lecture and we covered up to verse (79:30). We will start our next lecture from verse (79:31)

أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۔ وَتُبْ عَلَيْنَا ۔ إِنَّكَ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL NO. 28
VOL.68
ISSUE
4

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546 , 042-35753666
E-mail:idara@toluislam.com
web:www.toluislam.com

